ہفت روزہ

الفتح

کراچی

۳۰ مارچ - ۶ اپریل ۱۹۷۲



قیمت : ــــ ۵۰ پیسے

ہوائی ڈاک سے : ــــ ۷۵ پیسے

تیرے امیر مال مست، تیرے غریب حال مست

سرور بارہ بنکوی

پل پل ہے انمول

نیّا ڈانواں ڈول ہے ساتھی نیّا ڈانواں ڈول
آ مل کر کوئی راہ نکالیں، پل پل ہے انمول !

ساگر میں طوفان اٹھا ہے موج اڑاتے جھاگ
نیّا والے اِک دوجے کی خون سے کھیلیں پھاگ
سب کی اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ
یہی سمے ہے تو بھی اگر سچ بول سکے تو بول !
اے ساتھی۔ پل پل ہے انمول

اِک پتوار تو ٹوٹ چکا ہے، باقی ہیں بس چار
اونچی ہی ہوتی جاتی ہے نفرت کی دیوار !
سب کو اپنی فکر ہے نیّا کون لگائے پار
بھانڈا چور رہا ہے پر پھوٹا کھُل گیا ڈھول کا پول
اے ساتھی، پل پل ہے انمول

مُلّا مذہب کے بیوپاری، پھریں لئے قرآن
لیڈر کی جھولی میں روٹی، کپڑا اور مکان !
بیچ میں ننگی بھوکی جنتا، آج بھی ہے حیران
دیس کے بے بس ہاتھوں میں ہے اِک نیا کشکول
اے ساتھی، پل پل ہے انمول

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد : ۲ — شمارہ : ۴۶
۳۰ مارچ - ۶ اپریل ۱۹۷۲ء

مدیر
ارشاد راؤ

*

خاص مضامین

سرورق : اقبال غرقی

بدلِ اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :- ۶۰ فلس دوبئی، قطر : ۷۵ درم
سعودی عرب : ۱۵ قرش - انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقامِ اشاعت
ہفت روزہ الفتح، ۸۷ ڈی، نرسری کمرشل ایریا
پی، ای - سی - ایچ - ایس کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر :- ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد - کراچی

ٹیلیفون : —— ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

برق گرتی ہے تو ....

* پاکستان پیپلز پارٹی کے قومی اسمبلی کے رکن جناب مختار رانا گرفتار کر لئے گئے۔
* پاکستان پیپلز پارٹی کے سندھ صوبائی اسمبلی کے رکن جناب نبی بخش بھرگڑی گرفتار کر لئے گئے۔
* فلپس ریڈیو اور فلپس ٹیلی ویژن کے مزدور گرفتار کر لئے گئے۔
* پریمیر ٹوبیکو انڈسٹریز کے مزدور گرفتار کر لئے گئے۔
* ٹنڈو قیصر اور تعلقہ ٹنڈو باگو کے کسانوں کو جبری بیدخل کیا جا رہا ہے۔
* ملوں میں چھانٹی، تالہ بندی اور مزدوروں کے قانونی مطالبات تسلیم نہ کرنے کا رجحان تقویت پکڑ رہا ہے۔

صدر نے اعلان فرمایا ہے "گھیراؤ جلاؤ بند کرو۔"

مشیروں نے فرمان جاری کیا ہے "گھیراؤ جلاؤ انتشار پسند کروا رہے ہیں۔"

ریڈیو پاکستان کراچی ۱۰ محرم کے خصوصی پروگرام میں اعلان کرتا ہے "گھیراؤ جلاؤ کرنے والے یزید کے پیروکار ہیں۔"

ایک طرف یہ ہے۔

اور دوسری طرف یہ ہے۔

جماعتِ اسلامی، پی۔ڈی۔پی، کونسل لیگ، کنونشن لیگ، اسلامی جمعیت طلبہ اور دوسری مسترد سیاسی، سماجی اور طلبہ تنظیمیں مارشل لاء کے ضابطہ ۱۱۴ کے تحت برطرف کئے جانے والے بدعنوان، نااہل اور عوام دشمن نوکر شاہی کے تیرہ سو ملازمین کی بحالی کے حق میں شور مچاتے ہیں۔ حکومت کے اس ضابطے کی دھجیاں بکھیرتے ہیں۔ جلسے کرتے ہیں۔ جلوس نکالتے ہیں۔ گورنر ہاؤس کو گھیرتے ہیں۔ وزیروں اور مشیروں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ حکومت اعلان کرتی ہے۔ بے گناہ افسروں کو بحال کر دیا جائے گا۔ اور یہی نہیں بلکہ ماتحت بدعنوان ملازمین کی فہرست کے اعلان کے موقع پر نام نہاد دائیں بازو کے لیڈرانِ کرام کا خوف اس قدر کارگر ثابت ہوتا ہے کہ پندرہ سو میں سے صرف چھتر کو برطرف کیا جاتا ہے۔

لاہور میں دو طالبات کے اغواء کو دائیں بازو کی جماعتوں نے سیاسی مسئلہ بنا دیا حکومت نے اگرچہ مثالی کارنامہ انجام دیا کہ ان طالبات کو ۴۸ گھنٹے میں برآمد کر لیا۔

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

چلتے چلتے

لائلپور کے لاکھوں افراد کی رائے کو کوئی وقعت نہ دی گئی

پیپلز پارٹی غیر جانبداری کا ریکارڈ قائم کر رہی ہے

وقائع نویس

ضمانت ضبط

راشدی "ہلال پاکستان" کے ایڈیٹر

'ہلال پاکستان' ــــ سندھی میں پاکستان پیپلز پارٹی کا ترجمان حیدرآباد سے نکلتا ہے۔ کراچی تک آسانی سے پہنچ، سکتا ہے۔ اس کی مجموعی اشاعت کراچی کے عام اردو اخبار کی صرف کراچی میں اشاعت سے بھی کم ہے۔ کیونکہ سندھی بھی اردو اخبار زیادہ پڑھتے ہیں۔ پہلی حماقت تو یہ کہ کراچی سے اردو روزنامہ کی بجائے سندھی اخبار نکال رہے ہیں۔ حالانکہ اردو اخبار سے پیپلز پارٹی کو زیادہ تقویت پہنچتی ہے۔ کراچی میں سارے اخبارات سرمایہ داروں کے ہیں۔ اس لئے پارٹی کا اپنا اردو اخبار ضروری تھا۔ جسے نئے سندھی بھی پڑھ سکتے اور پرانے سندھی بھی۔ مگر پیپلز پارٹی کی مرضی کہ وہ 'ہلال پاکستان' کا کراچی ایڈیشن نکال رہی ہے اور اس کا ایڈیٹر جناب پیر علی محمد راشدی کو مقرر کیا جا رہا ہے۔ راشدی صاحب بڑے پرانے صحافی ہیں۔ "جنگ" میں دسمبر ۱۹۷۱ء تک انہوں نے موجودہ سربراہ مملکت کے خلاف بڑے معرکتہ الآراء کالم لکھے اور موجودہ سربراہ مملکت کی پارٹی کے ایک امیدوار عبداللہ شاہ نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پیر صاحب کی ضمانت ضبط کروائی تھی اب پارٹی کی اصولی طور پر مخالفت کرنے والے یہ حضرت پارٹی کے ترجمان کے چیف ایڈیٹر ہوں گے۔

غ۔ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔

ایم این اے، ایم پی اے اندر

پیپلز پارٹی ــــ صدر یحییٰ کی طرح ــــ غیر جانب ــــ داری کا ریکارڈ قائم کر رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کے ازلی ابدی دشمن اور عوام کی ہمیشہ سے مخالف ــــ دوسری جماعتوں کے رکن مارشل لاء، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے خلاف جانے کیا کچھ کہہ رہے ہیں ــــ مگر ان کے خلاف مارشل لاء حرکت میں نہیں آتا۔ مارشل لاء اگر مختار رانا کو ایک الزام میں گرفتار نہیں کر پاتا، تو دوسرا ضابطہ آجاتا ہے ــــ مختار رانا، یحییٰ خان کا بھی اسیر ــــ ذوالفقار علی بھٹو کا بھی اسیر ــــ یحییٰ خان نے لائل پور کے مختار رانا کے منتخب کرنے والے لاکھوں افراد کی رائے کو کوئی وقعت نہ دی اور نہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے اپنی پارٹی کے لاکھوں ووٹروں کی رائے کو وقیع جانا۔

ایک بھرگڑی صاحب بھی اندر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں ایک مشیر کے خلاف بھی بیان دیا تھا۔ جس نے ان کے بھائی کو ذاتی مخالفت کی وجہ سے ملازمت سے برطرف کروا دیا ہے۔

غ۔ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر۔

بیوروکریسی کے ساتھ صحیح سلوک

میر اعجاز علی تالپور۔ گورنر سندھ کے مشیر۔ حال ہی میں دورے پر گئے۔ ایک سائل نے انجینئر کے خلاف شکایت کی۔ انجینئر کو بلایا گیا تو انجینئر نے خالص بیوروکریٹک محاورے استعمال کر کے مشیر کو یہ باور کرانے کی کوشش کی، کہ یہ سوال کرنے والا بھی بے وقوف ہے۔ آپ بھی بے وقوف ہیں ٹیکنیکل طور پر یہ کام ہو ہی نہیں سکتا۔ ان حیلوں کو مشیر صاحب جانتے تھے۔ انہوں نے اپنی اتھارٹی استعمال کی اور کہا "آپ کھڑے ہو کر بات کریں آپ کو اندازہ نہیں کہ میں عوام کا نمائندہ ہوں اور آپ عوام کے خادم ہیں۔ مجھے آپ یہ ٹیکنیکل چکر نہ دیں۔ اور اپنے فرض کو پورا کریں۔ اور اب تشریف لے جائیے۔"

یہ انجینئر صاحب اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔

انجینئر اور سیکرٹری ایسا چکر ہر مشیر کو دیتے ہیں بہت سے سادہ لوح مشیران چکروں میں آجاتے ہیں اور پبلک کے کام ویسے کے ویسے رہ جاتے ہیں۔

بابر بعیش کوش "مشیری" دوبارہ نیست

گورنر سندھ کے ایک مشیر ایسے بھی ہیں، جن کی دیانت کی قسم اُن کے مخالف بھی کھاتے تھے، اور ان کی "عوامیت" مسلم تھی۔ لیکن سنا ہے۔ درنع برگردن راوی۔ کہ جب سے "مشاورت" ملی۔ انہوں نے سوچا ہے کہ ہمیشہ مشیری تو نہیں ملتی۔ کھاؤ پیو جان بناؤ۔ ایسی چیزیں بھی سنائی دے رہی ہیں کہ پیپلز پارٹی کے ایک مخالف۔ تھرپارکر کے بڑے زمیندار نے چالیس ہزار کی کار تحفے میں دی ہے۔ اور اپنے لاکھوں روپے کے کام کروا لئے ہیں۔ اسی طرح تھرپارکر کے لُنڈ بلوچوں کے علاقے میں عوام نے ان کا داخلہ بند کر دیا ہے، کیونکہ انہوں نے پیپلز پارٹی کے ووٹروں، کارکنوں لُنڈ بلوچوں کے مقابلے میں سردار کی کوئی بات تسلیم کی اور عوام کی اکثریت کا گلا گھونٹ دیا۔ پیپلز پارٹی اور عوام کے دشمن سردار سے انہوں نے تخلیے میں ایک گھنٹے تک ملاقات کی جب کہ اس قبیلے کے ایک عوامی رہنما کو کھڑے کھڑے مل کر دھتکار دیا کلوہی کے علاقے میں ان ہزاروں بلوچوں نے احتجاجی جلوس نکالا۔ اور اس مشیر کو انتباہ کیا ہے کہ وہ اب تھرپارکر میں قدم رکھیں گے تو ان سے نپٹ لیا جائے گا۔

ع۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

سندھی زبان اور میر علی بخش تالپور

میر صاحبان کے بارے میں نئے سندھی اور پرانے سندھی حلقے دونوں مطمئن رہے ہیں کہ ان میں عصبیت کی گنجائش نہیں ہے۔ میر علی احمد تالپور اور میر رسول بخش تالپور نے اب تک کوئی ایسا مظاہرہ بھی نہیں کیا تھا۔ مگر ان کے تیسرے بھائی میر علی بخش تالپور نے سندھی زبان کو قومی بولی بنانے کا مطالبہ کرنے والے اور کراچی میں اردو اخبار جلانے والے جلوس کی قیادت کر کے اس بھرم کو توڑ دیا۔ میر علی بخش تالپور ــــ عوام دوست اور ترقی پسند سمجھے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کل ان کی ینپ ڈی سے گاڑھی چھن رہی ہے۔ اور ان کے ساتھ مل کر وہ اندرا گاندھی زندہ باد، جگ جیون رام زندہ باد کے نعرے بھی بلند کرتے ہیں۔ وہ ایم۔ این اے بھی ہیں۔ قومی اسمبلی کا اجلاس ہونا ہے

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیں

احوالِ واقعی

خارجی امور کے ماہر صدر کے دور میں ناکام خارجہ پالیسی

واقفِ حال

صدر بھٹو خارجی امور کے ماہر ہیں مگر ان کے دور میں ہماری خارجہ پالیسی انتہائی مضحکہ خیز اور ناکام ہے۔

درونِ خانہ تمام تر اصلاحات کے باوجود ہم بیرونی دنیا میں اسی طرح معلق ہیں جس طرح یحییٰ خان کے زمانے میں تھے۔

صدر بھٹو کے مسلم ملکوں، چین اور آخر میں روس کے دورے کے باوجود مجموعی طور پر ہماری پوزیشن اب بھی کمزور ہے۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے والی مملکتوں سے ہم نے پہلے سفارتی تعلقات توڑنے شروع کیے۔ درمیان میں بہت سی ایسی مملکتوں سے ہم نے سفارتی ناطہ قائم ہی رکھا بلکہ ان میں سے ایک مملکت کا صدر محترم دورہ بھی کر کے آئے۔ اب ہم نے ان مملکتوں سے سفارتی تعلقات بحال کرنے شروع کر دیئے ہیں، توڑے کیوں؟ پھر بحال کیوں کیے اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا! بالکل اسی طرح جیسے عوام کو اب تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ داؤد اور ولیکا کو نظر بند کیوں کیا تھا اور پھر بعد میں چھوڑ کیوں دیا۔ اس سفارتی سرگرمی سے سفارتی سطح پر ہماری پوزیشن کو یقیناً نقصان پہنچا ہے کیونکہ ہمارے مؤقف کی سمت دوسری دنیا کی سمجھ میں نہیں آسکی۔

ہمارا محکمۂ خارجہ کس طرح چل رہا ہے؟ وزارتِ خارجہ کا قلمدان خود صدر کے پاس ہے پھر ایک ہی محکمہ ہے جس میں سیکرٹری کے علاوہ ایک سیکرٹری جنرل بھی ہے۔ اس کے باوجود نہ تو ہماری خارجہ پالیسی کی سمت واضح ہوتی ہے اور نہ بیرونِ ملک ہمارے سفارت خانوں کی کارکردگی سامنے آتی ہے۔

یہ درست ہے کہ یحییٰ خان کے زمانے میں عالمی سطح پر پاکستان کو بہت نقصان پہنچا۔ سفارتی طور پر ہم تنہا ہوئے۔ اس کا خمیازہ ہمیں اب بھی بھگتنا پڑ رہا ہے لیکن اب تو ایک سابق وزیر خارجہ، جو اپنے آپ کو خارجی امور کا ماہر سمجھتے ہیں، برسرِ اقتدار ہیں، انہیں تو اس میں کارہائے نمایاں انجام دینے چاہئیں۔ کس غیر ملک میں یا کس بیرونی اخبار میں پاکستان کا مؤقف پلیش ہو رہا ہے؟ صدر بھٹو جب پریس کانفرنس میں یہ کہتے ہیں

"عالمی ضمیر کو کیا ہوا، بیرونی اخبار نویسوں کے قلم کی سیاہی خشک کیوں ہو گئی۔ کیا پاکستانیوں کا خون، خون نہیں ہے؟؟؟"

کیا ان سے مؤدبانہ طور پر یہ پوچھا جا سکتا ہے

- ہمارے محکمۂ خارجہ کو کیا ہوا؟
- ہمارے سفارتخانوں پر کیا تالے پڑ گئے ہیں؟

ہم جو اپنے عوام کی خون پسینے کی کمائی کے کروڑوں روپے اپنے سفارتخانوں پر خرچ کرتے ہیں۔ سفارتی عملہ کے ارکان شاہانہ انداز کی زندگی گزارتے ہیں، آخر کس لیے؟ اگر عالمی ضمیر سویا ہوا ہے، بیرونی اخبار نویس کچھ نہیں لکھ رہے ہیں تو یہ کس کا قصور ہے —— ہمارے محکمۂ خارجہ کا —— سفارت خانوں کا —— بیرونی تشہیر کے محکموں کا —— وزارتِ اطلاعات و نشریات کا؟

ٹھیک ہے کہ صدر صاحب نے بڑی تیز رفتاری سے غیر ملکی دورے کیے ہیں۔ مشترکہ اعلامیے بھی جاری ہوئے ہیں۔ لیکن محض ان سے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا پاکستان اپنی پوزیشن کو جتنا کمزور کر چکا ہے۔ وہ ان مختصر سے دوروں سے درست نہیں ہو جائے گی۔ ان دوروں کے اثرات کو مستحکم کون کرے گا؟ یہ کام سفارت خانوں کو کرنا ہے۔ ہمارے سفارت خانے محض عشرت کدے ہیں جہاں ریٹائرڈ جرنیل اپنی باقی ماندہ زندگی گزار دیتے ہیں۔ جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں ایک منتخب عوامی حکومت قائم ہو گئی۔ ان سفارت خانوں میں کونسی عوامی تبدیلی ہوئی ہے۔ ہم جس بحران سے گزرے ہیں۔ اس کے بعد تو اس قدر تیز سفارتی سرگرمیاں ہونی چاہئے تھیں کہ بیرونی دنیا تھرتھرا جاتی۔

اس سے بڑی بدقسمتی اور ذلت کیا ہو گی کہ ہمارے آدھے ملک پر ہمارے دشمن نے قبضہ کر لیا۔ ہمارے ایک لاکھ قیدی بھارت کے پاس ہیں۔ ان پر وہ ہر طرح سے ظلم ڈھا رہا ہے لیکن کسی ایک ملک سے بھی تو اس کی مذمت میں کوئی آواز نہیں اٹھتی۔ "بنگلہ دیش" میں غیر بنگالیوں کا خون بہہ رہا ہے، کسی ملک سے انسانیت کے نام پر صدا بلند نہیں ہوئی۔ نہتے جنگی قیدیوں پر بھارتی درندوں نے فائر کھول دیا، کوئی آنکھ نم نہیں ہوئی۔ اس میں ان ملکوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور ہمارے سفارت خانوں کا ہے جو کسی ملک کو صورتِ حال کی سنگینی کا احساس نہیں دلا سکے ہمیں معلوم نہیں، ہمارے ہاں ایسی کوئی خبر نہیں چھپی کہ جنگی قیدیوں پر فائرنگ کے فوراً بعد کسی بھی ملک میں پاکستانی سفیر نے وہاں کے سربراہِ مملکت، وزیرِ اعظم یا وزیر خارجہ سے ملاقات کی ہو یا اسلام آباد میں محکمہ خارجہ نے غیر ملکی سفیروں کو بلا کر صورتِ حال سے مطلع کیا ہو! یا سلامتی کونسل کو حرکت میں لایا گیا ہو۔ دنیا بھر کے تمام ممالک آخر صرف پاکستان کے ساتھ ہی یہ ظالمانہ رویہ کیوں برت رہے ہیں؟

ہمارے سفارت خانوں کی نااہلی کی اصل وجہ یہ ہے کہ دو تین سفیروں کو چھوڑ کر ہماری سفارتی سروس دراصل ایک تحفے کے طور پر استعمال کی جاتی ہے جس سول افسر یا فوجی افسر کا ملک میں کوئی مصرف نہ ہو، اسے سفیر بنا کر بھیج دیا جاتا ہے۔ ایسا ناکارہ افسر کیا سفارتی مشن انجام دے گا اور اس کی ذہنی سیاسی اور سفارتی قابلیت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یحییٰ خان کے زمانے میں جنرل رضا، جنرل یوسف کے این حسین ایسے آدمی گئے۔ اب جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان جا رہے ہیں۔ دولتانہ برطانیہ جا رہے ہیں۔ اس نظریاتی حکومت کے قیام کے بعد تو خاص طور پر سفارت

خانوں میں بڑے پیمانے پر انقلابی تبدیلیاں عمل میں آنی چاہئیں مگر یہاں ہنوز روزِ اول والا قصہ ہے۔

پریس آتاشیوں کا مسئلہ

سفیروں کے بعد دوسری اہم حیثیت سفارت خانہ میں پریس آتاشی کی ہوتی ہے۔ ہمارے سفارت خانے چونکہ عیاشی کے اڈے ہیں اس لیے وہاں پریس آتاشی تجربہ کار عامل صحافیوں کی بجائے بیوروکریٹوں کو رکھا جاتا ہے وہ اپنی سرگرمیاں صرف کاک ٹیل اور گرل فرینڈز تک محدود رکھتے ہیں۔ ان ملکوں کے عامل صحافیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اس سلسلے میں بیرونِ ملک جانے والے صحافیوں دانشوروں اور دوسرے لوگوں کو تکلیف دہ واقعات کا مشاہدہ کرنا پڑا ہے۔ اگر اس ملک کا کوئی صحافی ہمارے پریس آتاشی سے پاکستان کا مؤقف جاننے کے لیے آ بھی جاتا ہے تو اسے پہلے تو "بھارتی ایجنٹ" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھارت کے سفارت خانے کی طرف سے مسلسل لٹریچر اور خبریں ملنے کے باعث اکثر بھارتی خبریں چھاپ چکا ہوتا ہے جبکہ ہمارے سفارت خانے نے کبھی ایسی تکلیف ہی نہیں کی ہوتی۔ ایسے میں ایک صحافی کو کیا ضرورت پڑی کہ وہ کسی ایسے ملک کا مؤقف شائع کرنے کی زحمت کرے جو اس سے بات تک کرنے کا روادار نہیں ہے۔ دوسرے تمام ممالک اپنے ملک کے حالات کی مناسبت سے زبان کے تعلق سے نوجوان، تیز اور مستعد صحافیوں کو پریس آتاشی کے طور پر رکھتے ہیں جو صحافیوں سے ذاتی اور پیشہ وارانہ تعلقات استوار کر کے اپنے مؤقف کو براہ راست اور بالواسطہ ان اخبارات میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ پریس آتاشیوں کا تقرر وزارت اطلاعات کو خود کرنا چاہیے۔ اس کے لیے پبلک سروس کمیشن کا تکلف نہیں ہونا چاہیئے۔ پبلک سروس کمیشن کے ذریعے جانے والے پریس آتاشیوں کی سرگرمیوں کا یہی غلط نتیجہ نکل سکتا ہے جس کے آج ہم شکار ہیں۔

وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی اور خود صدر بھٹو صحافیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہیں محب وطن صحافیوں کو باہر بھیج کر ان سے کوئی کام لینا چاہیئے۔

اندرونِ ملک تو ریڈیو ہے، ٹیلی ویژن ہے، نیشنل پریس ٹرسٹ ہے، "مساوات" ہے حکومت اپنا مؤقف آسانی سے پیش کر سکتی ہے۔ ضرورت تو بیرونِ ملک ہے، جہاں پاکستان سفارتی تنہائی کا شکار ہو رہا ہے۔

ہمارے ہاں ایک محکمہ بیرونی پبلسٹی بھی ہے جس کے سربراہ ایک بیوروکریٹ ہیں۔ اس محکمے نے بیرونِ ملک پاکستان کی کیا پبلسٹی کی ہے اور پاکستان کے مؤقف کو کتنا پھیلایا ہے۔ اس کا ثبوت دنیا بھر کے اخبارات فراہم کر سکتے ہیں جو بھارت اور بنگلہ دیش کے مؤقف کو اس کی عین روح کے مطابق پیش کر رہے ہیں۔ اس محکمے پر قوم کا لاکھوں روپے کا سرمایہ ختم ہوتا ہے۔ یہ محکمہ بجائے اس کے کہ بیرونِ ملک کوئی پبلسٹی کرے اندرونِ ملک پبلسٹی میں مداخلت کرتا رہتا ہے۔ مثلاً غیر ملکی دورے پر جانے والے صحافیوں کے نام اس محکمے کے ذریعے بھی دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ صحافی باہر کچھ نہیں لکھتے بلکہ واپس آکر اپنے مقامی اخبارات میں ہی کچھ لکھتے ہیں اس محکمے کے ذریعے بیرونِ ملک جو پاکستانی لٹریچر جاتا ہے۔ اس میں محض حکومت کے بلیٹن اور صدر صاحب کی تقریریں ہوتی ہیں۔ حالانکہ ان کو بیرونی اخبار نویس پہلے ہی ریڈیو وغیرہ پر سن لیتے ہیں، بعد میں ان کے پڑھنے یا ان سے کوئی خبر بنانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

ریڈیو کی
بیرونی سروس

بھارت نے پہلے ہمیں ٹینکوں اور طیاروں سے شکست دی۔ اب وہ ہمیں ٹرانسسٹرز سے شکست دے رہا ہے قیام پاکستان کے بعد ہی یوں تو بھارت کے ریڈیائی تبصرے بڑے سوچے سمجھے اور تخلیقی منصوبوں کا نتیجہ ہوتے تھے مشرقی پاکستان کے المیے یعنی مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد سے تو اس نے دو قومی نظریے یا پاکستان کے تصور کو ختم کرنے کی مسلسل اور باقاعدہ مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس کے تبصرے اتنے مدلل، منطقی اور پیش کش اتنی مؤثر ہوتی ہے کہ پاکستانیوں پر بھی اس کا اثر پڑ رہا ہے۔

اس کے مقابلے میں ہمارے تبصروں کا شروع سے یہ عالم ہے کہ وہ محض اپنے عوام پر حکومت کا مؤقف ٹھونسنے کے لیے نشر ہوتے ہیں۔ ان کے مخاطب پاکستان کے عوام ہوتے ہیں۔ بیرونی سروس میں کبھی مخاطبوں کے جغرافیائی سیاسی اور ثقافتی رجحانات کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ وظیفہ خواروں کی ایک فوج ہے جو صرف وظیفہ حاصل کرنے کے لیے ریڈیو اسٹیشنوں سے چمٹی ہوئی ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے کیسے حالات ہیں؟ اس وقت پراپیگنڈہ کا کیا رد ہونا چاہیئے۔

بیرونی سروس میں ہم اپنے بنگالی بھائیوں کو بالکل بھلا بیٹھے ہیں۔ ان کے دلوں میں سوئی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دینے کی ضرورت ہے۔ بھارتی ریڈیو بڑے نپے تلے انداز میں ہمارے ہاں علاقائی نفرتوں کو جنم دیتا ہے۔ ہم نے کبھی ناگالینڈ، میزوؤں اور سکھوں کے لیے مسلسل، متواتر اور سوچی سمجھی سکیم کے تحت پروگرام نشر نہیں کیے۔

بھارت کی عربی سروس بڑی مؤثر اور ہمہ گیر ہے۔ ہماری عربی سروس اس کے مقابلے میں انتہائی ناکارہ ہے حالانکہ مسلم ممالک میں ہمارے مؤقف کے سلسلے میں جو اتحاد ہے اس کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ٹرانسسٹرز کے ذریعے عرب دنیا میں نہایت پختہ مقام پیدا کریں۔

افسوس کی بات یہی ہے کہ بقول خود خارجی امور کے ماہر صدر بھٹو کی موجودگی میں ہم ناکام خارجہ پالیسی کا شکار ہیں۔ بیرونی دنیا میں ہم اپنے حق میں زمین ہموار نہیں کر سکے ہیں۔ اگر بیرونی دنیا ہمارے ساتھ ہو جاتی تو پھر اندرونِ ملک کنٹرول کرنا آسان ہو جاتا۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ جنگی قیدیوں کی واپسی ہے۔ یہ صرف سفارتی دباؤ کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ مسئلہ کسی طرح طے ہو جائے تو صدر بھٹو اندرونی مسائل پر زیادہ اچھی طرح توجہ دے سکتے ہیں۔ عوام دشمن طاقتیں اس مسئلے یا کمزوری کی بنیاد پر اندرونِ ملک احتجاج کی فضا پیدا کر کے صدر بھٹو کو بھارت کے آگے جھکنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ وہ جھک جائیں تب بھی ان کی پوزیشن ڈانواڈول ہو جائے گی، نہ جھکیں تو قیدی واپس نہ آئیں گے۔ اب صدر نے پریس کانفرنس میں جو مؤقف اختیار کیا ہے بادی النظر میں وہ ایک "بڑھک" معلوم ہوتی ہے۔ اگر کوئی سفارتی دباؤ بڑھا ہے یا بنگلہ دیش میں خود مجیب کی طاقت کمزور ہونے کا اندازہ ہے تو وہ ایک عارضی اور غیر یقینی بات ہے۔ اصل صورت یہی ہے کہ ہم اپنے سفارت خانوں میں انقلابی تبدیلیوں اور انتہائی تیز سفارتی سرگرمیوں کے ذریعے ہی فضا اپنے حق میں کر کے بھارت کا سفارتی گھیراؤ کر سکتے ہیں ورنہ حالات اور خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہم اپنے اندرونی حالات اور بیرونی حالات سے واقف ہیں۔ ہمارے پاس کوئی الہ دین کا چراغ ہے اور نہ مہدی موعود کا ظہور ہونے والا ہے کہ ہم بدستور اپنے زعم میں رہیں۔

اگر سفارت خانے یہ انقلابی کام نہیں کر سکتے تو اپنے تمام سفارتی مشنوں کو بند کر کے واپس بلا لیجئے اور اپنے ملک سے تمام سفارت خانوں کو چلے جانے دیجئے۔ اس طرح بھی ملک و قوم کا بھلا ہو گا اور کروڑوں روپے کا سرمایہ بچ جائے گا۔

محمود ہارون سے ایک ملاقات

بھٹو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے ذمہ دار ہیں

پاکستان میں گزشتہ ۲۵ سال کے دوران سیاسی شطرنج کے ماہر ترین خاندان کے ایک فرد اور ایوب خان کے سابق وزیر مسٹر محمود ہارون نے ذیل کا انٹرویو لندن کے ایک ہفت روزہ 'اخبارِ وطن' کے نمائندے کو دیا تھا۔ بعدازاں انہوں نے اس کی تردید کر دی۔ پاکستان میں مقبوضہ اخبارات نے یہ تردید شائع کی اور عوام کو اصل انٹرویو سے روایتی طور پر بے خبر رکھا۔ انٹرویو پیشِ خدمت ہے ——— (ادارہ)



پرویز بشیر

سابق مرکزی وزیر اور ممتاز سیاست دان جناب محمود ہارون نے کہا ہے کہ "بنگلہ دیش کو ایک آزاد اور خودمختار مملکت کی حیثیت سے فوراً تسلیم کر لینا چاہیئے اور پاکستان کے عوام کو حقائق کا سامنا کرنے کے قابل بنانا چاہیئے۔" ——— گزشتہ دنوں لندن میں اپنے قیام کے دوران اُنہوں نے راقم الحروف سے ایک خصوصی ملاقات کے دوران اعلان کیا کہ "بنگلہ دیش" ایک حقیقت ہے جسے تسلیم نہ کرنا نہ صرف یہ کہ انتہائی بیوقوفی ہے بلکہ حقائق سے جان بوجھکر آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے۔ جناب محمود ہارون نے خیال ظاہر کیا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے بعد ممکن ہے کہ آئندہ چند برسوں میں ہم پھر ایک ہو جائیں! میرے ایک سوال کے جواب میں کہ کیا ان کے خیال میں فوری طور پر کسی رسمی تعلق کے قائم ہونے کا امکان ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ——— "اتنے بڑے انسانی المیے کے بعد جس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوئی ہوں، ہزاروں عورتوں کی عصمت دری کی گئی ہو اور ہنستی کھیلتی بستیوں کو اجاڑ کر رکھ دیا گیا ہو، کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام پھر سے آپ کے ساتھ مل جائیں گے؟"

مشرقی پاکستان کا المیہ

جناب محمود ہارون نے کہا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد اس اسلامی مملکت کا وجود جسے لاکھوں انسانی جانوں کی قربانی دینے کے بعد حاصل کیا گیا تھا، ختم ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مَیں صرف سندھ، بلوچستان، پنجاب اور صوبہ سرحد کو پاکستان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ سقوطِ مشرقی کے ساتھ ہی مَیں بے وطن ہو گیا ہوں۔

انہوں نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیے پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ یحییٰ خان اور ان کے فوجی جرنیل اور افسرانِ شاہی کے ذمہ دار حکام کے علاوہ پاکستان کے موجودہ صدر مسٹر بھٹو بھی اکثریتی پارٹی عوامی لیگ کو اقتدار منتقل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ مسٹر بھٹو نے انتخابات نے فوراً بعد مغربی پاکستان کو ایک علیحدہ اور خودکفیل اقتصادی اکائی کی حیثیت سے سوچنا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صدر کے اقتصادی مشیر ایم ایم احمد، ماہرِ اقتصادیات، نذیر صوفی اور قمرالاسلام سے اس ضمن میں رائے طلب کی، جنہوں نے رائے دی کہ مغربی پاکستان ایک علیحدہ اقتصادی اکائی کی حیثیت سے زندہ رہ سکتا ہے۔ اس ضمن میں محمود ہارون نے مسٹر بھٹو کی کراچی والی تقریر کا بھی حوالہ دیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ انہوں نے مسٹر بھٹو کی طرف سے قومی اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کرنے کا مطالبہ کرنے اور اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے والوں کی ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکی کا بھی تذکرہ کیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ۲۰ فروری کو کابینہ برخاست کیے جانے سے صرف دو دِن قبل مَیں نے یحییٰ خان کو مشرقی پاکستان کی نازک صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے صدر کو بتایا کہ اگر عوامی لیگ کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے اور اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا گیا تو حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ صدر یحییٰ خان نے مجھ سے اتفاق کیا لیکن بعد میں صدر کے مشیر فوجی جرنیلوں نے انہیں کہا کہ "محمود ہارون تو مجیب کا ایجنٹ ہے!" ——— اور اس کے ساتھ ہی حالات بدل گئے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ پاکستانی اپنے ہی دشمن بھارت کے پاس پناہ گزین ہوئے اور مسلمانوں نے ہندوؤں سے امان طلب کی۔

بھٹو کی ہوسِ اقتدار

جناب محمود ہارون کے مطابق مسٹر بھٹو ابتدا ہی سے اقتدار پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ سابق صدر ایوب خان کو ملک میں بدترین ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے کا مشورہ دیتے رہے۔ ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ ایوب خان انہیں اپنا جانشین مقرر کر دیں۔ لیکن جلد ہی مسٹر بھٹو نے محسوس کیا کہ ایوب خان کے قائم کردہ نظام میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں، کوئی فوجی جرنیل ہی ایوب کی جگہ لے گا۔ چنانچہ انہوں نے فوج ہی کو برباد کرنے کی سازش کی تاکہ کسی فوجی جرنیل کے برسرِ اقتدار آنے کی گنجائش نہ رہے۔

انہوں نے الزام لگایا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ اور اس کے نتائج کی بڑی ذمہ داری مسٹر بھٹو پر عائد ہوتی ہے۔ اعلانِ تاشقند

’بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرنا، حقیقت کو جھٹلانا ہے‘

عین مسٹر بھٹو کی مرضی و منشا کے مطابق ہوا۔ اس سے سیاسی فائدہ انہوں نے صرف اس لیے اٹھایا کیونکہ ایوب خان نے انہیں برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ محمود ہارون نے دعویٰ کیا کہ مسٹر بھٹو نے معاہدۂ تاشقند کی ایک ایسی دستاویز پر دستخط کیے تھے جس کے الفاظ یہ تھے:

”پاکستان اور پاکستان کے عوام کے لیے اس سے زیادہ مفید اور کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا“

انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ معاہدے کی بات چیت کے دوران روسی وزیرِ اعظم مسٹر کوسیجن نے ایوب خان سے کہا تھا ——— ”تمہارا وزیر خارجہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ تم اس شخص پر بہت اعتماد کرتے ہو لیکن اس کی نگاہیں بتا رہی ہیں کہ وقت پڑنے پر تمہیں دھوکہ دے گا۔“

محمود ہارون کا کہنا ہے کہ اس کے بعد پاکستان پہنچ کر ایوب خان مسٹر بھٹو سے کھنچے کھنچے رہنے لگے اور دو تین ماہ بعد انہیں کابینہ سے برخاست کر دیا تھا۔

ایم ایم احمد نے کہا ”ڈھائی فٹے“ بنگالیوں کو اقتدار منتقل نہیں کیا جائے گا

جناب محمود ہارون کے مطابق مشرقی پاکستان کے المیے کی بھاری ذمہ داری پاکستان کی نوکر شاہی پر بھی عائد ہوتی ہے انہوں نے کہا کہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر یہ لوگ عوامی لیگ کو اقتدار منتقل نہیں کرنا چاہتے تھے اور ہمیشہ یحییٰ کو غلط مشورے دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کے بعد مسٹر ایم ایم احمد نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ”ڈھائی فٹے بنگالیوں کو اقتدار منتقل نہیں کیا جائے گا۔“

سابقہ نظامِ معیشت اپنانا بیوقوفی ہے

محمود ہارون نے سوشلزم کو سرمایہ داری اور کمیونزم کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ نظام صرف ترقی یافتہ ممالک ہی میں کامیاب ہوا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے اکثر ممالک نے اسے اپنایا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ممالک ہمیشہ کے لیے بڑے ممالک کے دستِ نگر بن گئے۔ آج ہم جس موڑ پر ہیں اس کا تقاضا ہے کہ ہم فوری طور پر اپنی منزل کا تعین کر لیں۔ اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ہم مزید تجربات کریں۔ قوم بہت سی آزمائشوں سے گزر رہی ہے اسے مزید آزمائشوں میں مبتلا نہیں کرنا چاہیئے۔ صنعتوں کو اگر قومی ملکیت میں لینا ہے تو پورے خلوص سے کام لیجئے۔ سرکاری تحویل میں لی گئی صنعتیں ابتدائی مراحل میں ہیں۔ اس کے برعکس جو صنعتیں، تجارتی و اقتصادی ادارے مستحکم ہیں انہیں چھوا تک نہیں گیا۔ انہوں نے کہا کہ میرے ان خیالات کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہم پھر پرانے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کی طرف لوٹ جائیں، یہ بے وقوفی ہوگی۔ آزاد معیشت ہمارے ملک میں قطعی ناکام ہو چکی ہے۔ لوگوں نے اس سے ناجائز فائدے اٹھائے ہیں۔ سو فیصد اور ڈھائی سو فیصد تک نفع کما کر عوام کا خون چوسا گیا ہے لیکن صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لے کر ان کا انتظام سرکاری افسروں کے سپرد کرنے سے مسائل الجھ جائیں گے۔ سرکاری افسروں کی تنخواہ لگی بندھی ہوتی ہے۔ دس لاکھ کی پیداوار ہو یا ساٹھ لاکھ کی، انہیں اس سے کوئی فطری لگاؤ نہیں ان کا بنیادی مقصد ملازمت ہے۔ دوسرے الفاظ میں پیداوار کے گھٹنے بڑھنے سے ان کی دلچسپی نہیں۔ اس طرح جہاں صنعتی پیداوار متاثر ہوگی وہاں لازمی طور پر بے روزگاری میں بھی اضافہ ہوگا۔

غیر ممالک میں چھپا ہوا زرِ مبادلہ

جناب محمود ہارون کے مطابق پاکستانی صنعت کاروں نے یقینی طور پر غیر ممالک میں زرِ مبادلہ جمع کرا رکھا ہے۔ اس چھپے ہوئے زرِ مبادلہ کی تعداد حکومت کے اندازوں سے کہیں زیادہ ہے لیکن زبردستی کرنے سے یہ رقم واپس نہیں آسکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں سیاسی استحکام ہو اور اقتصادی

باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ فرمایئے۔

ملاقات کا جواز کیا تھا — ؟



معزز قارئین! انٹرویو کی اشاعت پر جناب محمود ہارون نے ایک خط میں اظہارِ ناراضگی کیا ہے، اس خط کی تصویر شائع کی جا رہی ہے، انٹرویو کی اشاعت کے دوسرے دن ایک مقامی اردو روزنامے نے ان کے انٹرویو کی تردید کر دی تھی۔

اس انٹرویو کا پس منظر یہ ہے کہ میں جناب محمود ہارون سے ۲۶ جنوری کو ملاقات کے لئے پہنچا اس وقت دن کے ۱۱ بجے تھے میں نے محمود ہارون صاحب سے تقریباً ۲½ گھنٹے تک تفصیلی بات چیت کی اس ضمن میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میں ان سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھا اور میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی — بات چیت کے دوران پاکستان کے ماضی، حال اور مستقبل، کے بارے میں بیشمار موضوعات زیرِ بحث آئے — انہوں نے بڑی تفصیل سے پاکستان کے حالیہ المیہ کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی بات چیت کے اختتام پر انہوں نے کہا کہ جب وہ پاکستان چلے جائیں تو اس انٹرویو کو شائع کیا جائے اس کی وجہ موصوف نے یہ بتائی کہ ملک سے باہر ہوتے ہوئے ان کے بیان کو بزدلی تصور کیا جائے گا اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ دس دن تک پاکستان جا رہے ہیں اس حساب سے انہیں ۵ فروری تک پاکستان پہنچ جانا چاہیئے تھا لیکن میں نے احتیاطاً بار بار ٹیلی فون کیا تاکہ پتہ چل سکے لیکن ان سے رابطہ قائم نہ ہو سکا چنانچہ ان کے اپنے بیان کی روشنی میں کہ وہ دس دن تک پاکستان چلے جائیں گے، میرے سے یہ تاثر قائم کیا قدرتی امر تھا کہ وہ اب برطانیہ میں نہیں ہیں چنانچہ انٹرویو لینے کے ٹھیک ۱۴ دن بعد اسے

c/o Mr. Musa Patel,
30, Montrose Court,
Exhibition Road,
London, S.W.7.

February 9, 1972.

The Editor,
Akhbar-e-Watan Weekly,
295, Gray's Inn Road,
London, W.C.1.

Sir:

I was surprised to read in Akhbar-e-Watan of 16th February 1972, an interview purported to have been given by me to your representative. I strongly repudiate what has been ascribed to me in this interview.

As a matter of fact, when your Correspondent contacted me on the telephone, I specifically declined to make any statement or give any interview. I emphatically told him that so long as I was away from my country, I would refrain from expressing any views on any aspect of developments in Pakistan. I further told him that if at all I were to offer my views, I would do that only on my return to my country.

On your Correspondent's insistence that he merely wanted to pay a courtesy call, I agreed to meet him: but reiterated that, under no circumstances, would I make a statement or give an interview. During this courtesy meeting, no interview was given by me, nor any notes taken by your Correspondent.

I should be obliged if you would, therefore, publish my repudiation in an appropriate manner so that the totally misleading impression created by views which have wrongly been ascribed to me is dispelled.

Yours sincerely,

(Mahmood A. Haroon)

شائع کر دیا گیا، مذکورہ انٹرویو میں جو کچھ چھپا وہ محمود ہارون صاحب کے اپنے بیان پر مبنی تھا اور اسے قومی مفاد کے پیشِ نظر شائع کیا گیا تھا۔

میر دمیز راشد

"ڈان" پر ہارون خاندان کے غاصبانہ قبضہ کی داستان

بابائے قوم نے "ڈان" کو قومی ٹرسٹ میں تبدیل کر دیا تھا

ہارون خاندان کے پاس "ڈان" کی ملکیت کا کوئی ثبوت نہیں

الفتح رپورٹ

یہ سب تو ہارون خاندان کے ایک فرد کے فاضلانہ خیالات ہیں۔ اس خاندان کے بزرگوں نے تحریک پاکستان میں بہت نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ لیکن پاکستان کے قیام کے بعد اس خاندان نے نہ صرف پاکستان کو اپنی جاگیر بنایا بلکہ اس کو اپنی بین الاقوامی حیثیت بنانے کے لئے بھی استعمال کیا۔ محمود ہارون صاحب تو اب اس ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی یوسف ہارون تو ہمیشہ ملک سے باہر رہتے ہیں اور نیویارک میں بیٹھ کر بین الاقوامی سازشوں میں حصہ لیتے ہیں۔ "الفتح" میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ یوسف ہارون اسلحے کی امریکی فرم کے حصے دار ہیں۔ ان کا کام اسلحہ فروخت کرنا ہے۔ اس تجارت میں وہ اسرائیل اور بیافرا کو بھی اسلحہ فروخت کر چکے ہیں۔ اب سنا ہے کہ بنگلہ دیش کو بھی وہی اسلحہ فراہم کریں گے۔ صدر بھٹو نے اپنی انتخابی مہم کے دوران کئی بار عام جلسوں میں کہا تھا کہ ایوب خان نے یوسف ہارون کو پہلے ملک بدر اس لئے کیا تھا کہ وہ سی آئی اے کے ایجنٹ تھے۔ پھر امریکہ کے کہنے پر ایوب خان نے اپنے آخری تین دن میں انہیں نیویارک سے بلا کر مغربی پاکستان کی گورنری عطا کر دی تھی۔ اس وقت اخبارات نے بشمول اردو کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ "جنگ" نے بھی یوسف ہارون کو خلیفہ ہارون الرشید کے طور پر پیش کیا۔ مگر تین روز بعد ایوب خان کا زوال آگیا اور یحییٰ خان نے حکومت پر قبضہ کر لیا، تو یوسف ہارون پھر اپنے "وطن مالوف" لوٹ گئے۔ لیکن ہر حکومت میں ہارون خاندان کا حصہ لازمی ہے۔ اس لئے یحییٰ خان کو محمود ہارون کو مرکزی کابینہ میں لینا پڑا۔ محمود ہارون نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اپنے وزارتی اثر و رسوخ کو استعمال کیا۔ یوسف ہارون بھی ایک شیروانی اور ٹوپی پہن کر نیویارک سے کراچی آگئے اور یہاں اپنے تیسرے بھائی سعید ہارون کے الیکشن کے لئے دن رات کام کرنے لگے۔ لیاری کے کرانیوں کے ساتھ نیچے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر چائے پی، لیاری کے عوام سے گلے ملنے گھروں میں جانے لگے۔ لیاری کے کرانیوں کے پاؤں پر اپنی ٹوپی رکھ رکھ کر ڈرامے کئے۔ صدر بھٹو نے گبول پارک میں اور پھر لگری گراؤنڈ میں ستار گبول کے انتخابی جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہارون خاندان کی میرے دل میں عزت ہے، لیکن اس خاندان نے لیاری کے مظلوم عوام کے ساتھ کیا کیا۔ ایک صاحب ہمیشہ نیویارک میں رہتے ہیں۔ مگر جب ووٹوں کا وقت آتا ہے تو وہ جہاز سے نیویارک سے لیاری پہنچتے ہیں اور پھر فٹ پاتھوں پر بیٹھ کر عوام کے ساتھ چائے پی کر ووٹ مانگتے ہیں۔ مگر اب عوام ان شیروانی اور ٹوپی پہننے والے پنڈتوں کو پہچان چکے ہیں۔ سی آئی اے کے ایجنٹوں کو لوگ خوب جانتے ہیں۔ ایوب خان نے انہیں ملک سے کیوں نکالا تھا۔ پھر کس شرط پر یہ واپس آئے اور گورنر بنا دیئے گئے تھے۔"

اس خاندان نے ڈان گروپ کے اخبارات کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے انتہائی مذموم انداز میں استعمال کیا۔ روزنامہ ڈان پر بھی اس خاندان نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ صرف پاکستان میں ہی ممکن ہے کہ اس طرح دھاندلیوں کے ذریعے کسی ادارے کو اپنے قبضے میں لے لیا جائے اور پھر اس سے من مانے مقاصد پورے کئے جائیں، اور نہ کوئی داد کرے نہ فریاد۔

ڈان کے اجراء اور پھر قبضے کی مصدقہ کہانی

روزنامہ "ڈان" کے سلسلے میں پہلے بھی کئی بار یہ آوازیں بلند ہو چکی ہیں کہ اس کا اصل مالک کون ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے بھی ایک بار مطالبہ کیا تھا کہ یہ ہارون گروپ کی ملکیت نہیں ہے۔ عوام کی ملکیت ہے۔ اسے اس کے ٹرسٹ کو واپس کیا جائے۔ لیکن اس وقت ایوب خان اور اُن کے سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر نے انتہائی مخالفت کی۔ آج کے ڈان کے چیف ایڈیٹر نے اس سلسلے میں نہایت نمایاں کردار ادا کیا۔ اور ڈان کی اس کے جائز حق داروں کو واپس نہ ہونے دیا۔ کیونکہ اس طرح ایک بہت بڑا ہتھیار سرمایہ دار گروپ کے ہاتھ سے چلا جاتا۔

حال ہی میں ایک نہایت مصدقہ دستاویز اس سلسلے میں "الفتح" کو دستیاب ہوئی ہے۔ جس میں "ڈان" کے اجراء اور اس پر ہارون خاندان کے غاصبانہ قبضے کی داستان بھی بیان کی گئی ہے۔ اس میں لکھا گیا ہے۔ کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آخر میں جب مسلمانوں کی آزادی کی جد و جہد زوروں پر تھی۔ اس وقت ہماری دس کروڑ افراد پر مشتمل قوم ہندوؤں کے مقابلے میں ہر شعبۂ زندگی میں پس ماندگی کا شکار تھے۔ صحافت کا شعبہ اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اُردو میں محض چند ایک روزنامے ہفت روزے اور ماہنامے نکلتے تھے یا دوسری مقامی زبانوں میں ایسی ہی کچھ مطبوعات ہیں۔ ملک کی صحافتی دنیا میں مسلم قوم کو مؤثر آواز حاصل نہ تھی۔ اور انگریزی زبان کے میدان میں تو مسلم قوم کی آواز کمزور ترین تھی۔ کلکتہ سے صرف ایک "ماہنامہ" "مسلمان" چھپتا تھا جسے غیر مسلم مجلس کی سرپرستی حاصل تھی۔ دوسرے ایک شام کا اخبار "سٹار آف انڈیا" اسے پہلے خواجہ ناظم الدین کی قیادت میں ایک مسلم گروپ نکالتا تھا اس کے علاوہ پورے برصغیر میں مسلمانوں کے جذبات اور امنگوں کی ترجمانی کے لئے کوئی آواز میسر نہ تھی۔ حتیٰ کہ کلکتہ میں ۱۹۳۴ء میں "مورننگ نیوز" ایک روزنامہ کے طور پر طلوع ہوا۔ یہ خواجہ نور الدین مرحوم اور اے آر صدیق مرحوم کی جرأت کا نتیجہ تھا۔ "مورننگ نیوز" نے "سٹار آف انڈیا" کی طرح مسلم لیگ کی مکمل حمایت کی اور بین الاقوامی سطح پر بھی مسلمانوں کے معاملات کو فوقیت دی۔ لیکن جیسے جیسے سیاسی حالات بدل رہے تھے اور

روس اور بھارت کے ناپاک منصوبوں کا وکیل —— ہارون خاندان

مسلم لیگ۔ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد ترجمان کی حیثیت سے نہایت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس وقت اسے اپنے اغراض ومقاصد عوام تک پہنچانے کے لئے مزید ہفت روزوں اور اردو روزناموں کی ضرورت تھی۔ ان حالات میں ہی قائداعظم نے دہلی سے انگریزی میں مسلم لیگ کا ایک ہفت روزہ رسالہ چھاپنے کا فیصلہ کیا اور ہفت روزہ "ڈان"۔ اسی سلسلے میں ۱۹۴۲ء میں طلوع ہوا۔ اس میں مسلم لیگ کے لیڈروں اور پارٹی کی سرگرمیوں کی مخلصانہ رپورٹنگ ہوتی تھی۔ لیاقت علی خان کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری کی حیثیت سے اس رسالے کی پالیسی کی نگرانی اور دوسرے امور کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی گئی۔ سات مہینے بعد ۱۹۴۳ء میں اس ہفت روزے کو روزنامہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہفت روزہ "ڈان" کو روزنامے میں تبدیل کرنا بلاشبہ زیادہ اخراجات والا معاملہ تھا اور اس سلسلے میں کچھ کرنا ضروری تھا تاکہ ملک کے اندر اور باہر مسلم لیگ کی مقبولیت اور ترقی کی معقول اور موثر انداز سے تشہیر ہو سکے۔ قائداعظم نے راجہ صاحب آف محمود آباد اور اس دستاویز کے مصنف سے بات کی اور دہلی سے ایک روزنامہ اخبار کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہم مل جل کر اس مہم کو چلائیں۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ وہ راجہ صاحب اور اصفہانی خاندان۔ میں سے ہر ایک گیارہ ہزار روپے چندہ دے۔ تاکہ پہلے سال کا نقصان پورا ہو سکے۔ اور آئندہ کے لئے کام چالو رہ سکے۔ انہیں اعتماد تھا کہ مسلمان اس قومی اہمیت کے اقدام کی حمایت اور توثیق کریں گے۔ جو برطانیہ کے چلے جانے اور آزادی کے بعد ان کی بقا کے لئے انتہائی ضروری ہو گا۔ اس دستاویز کے مصنف نے یہ تجویز اپنے بڑے بھائی تک پہنچا دی، جنہوں نے فوراً آمادگی ظاہر کی اور اس طرح "ڈان" کا اجراء ہوا۔

ایک روزنامے کے لئے تجربہ کار اور اچھے ایڈیٹر کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کا حلقۂ قارئین مؤثر ہو جائے۔ اس کی تزئین وترتیب بھی عمدہ ہونی چاہیئے۔ تاکہ یہ مشتہرین کی توجہ مبذول کر سکے۔ اس لئے ڈان کے لئے ایک اچھے ایڈیٹر کی تلاش تھی اور اس کے لئے کلکتہ کے "سٹار آف انڈیا" کے ایڈیٹر پوتھن جوزف کے سوا کوئی دکھائی نہ دیا۔ یہ کیرالا کے ایک عیسائی تھے۔ تجربہ کار صحافی، اداریہ نویسی کے ماہر اور انہیں انگریزی پر بڑا مکمل عبور ہے۔

قائداعظم نے "سٹار آف انڈیا" کے مالکان سے کہا کہ وہ جوزف کو "ڈان" کے لئے قومی مفاد میں فارغ کر دیں۔ ان کی جگہ یو پی کالج کے انگریزی کے لیکچرر مسٹر عثمان انصاری کو بلا کر سٹار آف انڈیا کا ایڈیٹر بنایا گیا۔

ڈان کا آغاز انتہائی شاندار ہوا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اس کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ پوتھن جوزف ایڈیٹر کی نشست پر اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے انفرمیشن ممبر سر سلطان احمد نے حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات میں ایک زیادہ تنخواہ والی جگہ پر بلا لیا۔ اس کے بعد ڈان کے لئے ایڈیٹر کی پھر مشکل پیدا ہو گئی۔ اب ایک اور ایڈیٹر کی تلاش درپیش تھی جس کے قلم میں اتنی ہی طاقت ہو۔

قائداعظم نے خواہش ظاہر کی کہ الطاف حسین کو ڈان میں بلایا جائے جو "سٹیٹسمین" میں عین الملک کے قلمی نام سے مستقل کالموں میں آزادی اور امور مملکت میں مسلمانوں کے جائز حصے کی وکالت کرتے تھے۔ الطاف حسین کے لئے یہ فیصلہ کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ کیونکہ انہیں ایک مستقل سرکاری ملازمت چھوڑنا پڑ رہی تھی۔ جس میں تنخواہ بھی اچھی مل رہی تھی، اور بعد میں پنشن بھی ملنا تھی۔ اور ادھر ایک نئے میدان میں کسی مستقبل کی ضمانت کے بغیر شامل ہونا تھا۔ بہر حال الطاف حسین مالی قربانی کے لئے تیار ہو گئے اور "ڈان" دہلی کے ایڈیٹر بن گئے۔ قائداعظم تک یہ اطلاع پہنچی تو وہ بہت مطمئن ہوئے۔

اس عرصے میں روزنامہ "ڈان" نجی انتظامات کے تحت شائع ہوتا تھا۔ جناب لیاقت علی خان کو پارٹی کے کام اور اخبار کے معاملات کی دیکھ بھال کے لئے ۲۰۰۰ روپیہ ماہانہ اعزازیہ ملتا تھا۔ مگر پارٹی کا کام بڑھ رہا تھا اور ان کا پورا وقت اس پر صرف ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے کام کی طرف بالکل توجہ نہ دے سکتے تھے۔

ڈان کے روزنامہ بننے کے کچھ عرصہ بعد ناتجربہ کار منصوبہ بندی کے باعث، کاغذ کی کمی کے باعث اخبار کے بند ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس زمانے میں دہلی میں کوئی روزنامہ یا رسالہ کاغذ نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ "ڈان" کو کاغذ دینے کا مطلب یہ تھا کہ آپ ایسے ناگ کو دودھ پلائیں جو آپ ہی کو ڈنگ مارتا ہو۔ اس دستاویز کے مصنف کو کلکتہ میں یہ تشویشناک اطلاع بھیجی گئی، اور انہوں نے ایک سپیشل ویگن کے ذریعے ۲۵ ہزار روپے کی مالیت کا نیوز پرنٹ دہلی بھیجا۔ اس سے اس خطرناک بحران کا خاتمہ ہو گیا جو مسلم لیگ پارٹی کی حیثیت پر کاری ضرب لگا دیتا۔

ڈان طاقت ور ہوتا گیا۔ اس کی اشاعت اور اشتہاری سرپرستی میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا، اور جب پاکستان قائم ہوا۔ اس وقت یہ ایک مشہور اور مقبول روزنامہ تھا۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے بعد۔ قائداعظم نے "ڈان" کے مستقبل کی طرف توجہ دی۔ اسے دہلی سے نئی مملکت کے دارالحکومت کراچی میں منتقل ہونا تھا۔ انہوں نے یہ تجویز کیا کہ چونکہ اخبار اب ترقی کر چکا ہے اور اس نے مسلمان قوم کی تحریک کی نمایاں خدمت سرانجام دی ہے۔ اس کے تینوں عطیہ دہندگان کو اپنی رقم چھوڑ دینی چاہیئے۔ اور اس اخبار کو ایک "قومی ٹرسٹ" میں تبدیل کر دینا چاہیئے۔ اس کا چونکہ اپنا کوئی پریس نہ تھا۔ اس کی چھپائی کا انتظام ہارون خاندان کے پریس میں کیا گیا۔ راجہ صاحب اور اس دستاویز کے مصنف کے مطابق قائداعظم کے انتقال تک اس معاملے کی نوعیت یہی تھی۔ ان حالات میں یہ انتہائی حیران کن امر ہے اور ایک معمہ بھی کہ یہ "قومی ٹرسٹ" موجودہ پبلشروں کی جائیداد کیسے بن گیا۔ خود محترمہ فاطمہ جناح کے لئے بھی یہ امر پُراسرار رہا کہ ہارون اس کے مالک کیسے بن گئے۔ اس دستاویز کا مصنف لکھتا ہے کہ جہاں تک اس کی معلومات کا تعلق ہے۔ آج اس قومی جائیداد کی ملکیت کا دعویٰ کرنے والے اس سلسلے میں ثبوت کے طور پر کاغذ کا ایک پُرزہ بھی نہیں پیش کر سکتے، جس میں اس اخبار کے ان بانیوں اور جائز مالکوں کی طرف سے اس کی ملکیت کے حقوق موجودہ مالکوں کو منتقل کئے گئے ہوں۔ ان بانیوں اور جائز مالکوں نے اسے ایک قومی ٹرسٹ میں اپنی آزادانہ مرضی سے تبدیل کیا تھا۔"

یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس کے سلسلے میں فوری قدم اٹھانا موجودہ حکومت کا سب سے اہم فرض ہے کیونکہ لیاری کے غریب عوام کا برسوں سے استحصال کرنے والے اس خاندان نے اس قومی امانت پر نہ صرف غاصبانہ قبضہ کیا ہے بلکہ اسے ایوب خان کی آمریت کو مستحکم کرنے کے لئے استعمال کیا۔ پھر اسے ہمیشہ عوام دشمن سازشوں کے لئے آلۂ کار بنایا۔

لندن پلان

صدر بھٹو جس "لندن پلان" کا ذکر کرتے رہے، اس کا عملی مظہر "ڈان"، اخبار ہی تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن۔ ممتاز دولتانہ

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں



سامراج اور سوشل سامراج کی نوآبادی بنگلہ دیش کے قیام کا مقصد چین کے گرد حصار قائم کرنا ہے



بنگالی گوریلوں کے خلاف بھارت اور بنگلہ دیش کا گٹھ جوڑ

شامگاد

"ہم بھارتی فضائیہ کے ایک طیارے میں سفر کر رہے تھے۔ طیارہ آسام کی پہاڑیوں کو عبور کرتا ہوا بنگلہ دیش کی حدود میں داخل ہو گیا۔ مشرقی بنگلہ دیش کے ہرے بھرے اور لہلہاتے کھیت صاف نظر آ رہے تھے ایک بھارتی اخبار نویس نے طیارے کی کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے بھارتی فضائیہ کے ایک افسر سے پوچھا۔

"کیا واقعی ہم بنگلہ دیش پر پرواز کر رہے ہیں؟"

"ہاں! ہم اس وقت بنگلہ دیش کی حدود میں ہیں یہ علاقہ اب ہمارا ہے!"، فضائیہ کے افسر نے جواب دیا۔"

یہ اقتباس سویڈن کے صحافی انگوراد جا کے ایک مضمون کا ہے۔ انگوراد جا نے فروری ۱۹۷۲ء میں بھارت اور بنگلہ دیش کا دورہ کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ نہ صرف بھارتی فوجی ہی بنگلہ دیش کو بھارت کا حصہ سمجھتے ہیں بلکہ پورے بھارت میں یہی تصوّر پایا جاتا ہے۔ سنجیدہ سرکاری حکام اور دانشور اگرچہ بنگلہ دیش کو بھارت کا قانونی اور سرکاری حصہ نہیں سمجھتے۔ لیکن انہیں یقین کامل ہے کہ بنگلہ دیش کی حکومت نئی دہلی کی ہدایات پر عمل کرے گی۔ انگوراجا آگے چل کر لکھتے ہیں: —— "فتح کے بعد بھارت یہ یقین دہانی چاہتا ہے کہ نئے ملک کی ترقی میں اس کا اثر زیادہ رہے تاکہ بنگلہ دیش بھارت کے لیے سیاسی خطرہ نہ بن سکے۔"

ان ناپاک منصوبوں کی تکمیل کے لیے بھارت نے ۱۹ر مارچ ۱۹۷۲ء کو بنگلہ دیش سے دفاعی معاہدہ کر کے اسے اپنے حلقۂ اسیری میں لے لیا۔ یہ اور بات ہے کہ دفاعی معاہدے پر "امن، سیکولرازم، جمہوریت اور سوشلزم" کی چینی چڑھی ہوئی تھی۔ یہ سمجھوتہ ۲۵ سال کے لیے کیا گیا۔ اس کی اہم دفعات یہ ہیں:

- معاہدہ میں شریک کسی ملک پر حملہ ہوا یا حملے کا خطرہ ہوا تو اس کا مقابلہ کرنے اور امن قائم رکھنے کے لیے فوری طور پر آپس میں صلاح مشورہ کریں گے۔
- معاہدہ میں شریک ممالک غیر جانبداری اور پُرامن بقائے باہمی پر یقین رکھتے ہیں اور اسے عالمی کشیدگی دور کرنے کے لیے اہم سمجھتے ہیں۔
- کوئی فریق کسی ایسے فوجی معاہدے یا اتحاد میں شریک نہیں ہوگا جو دوسرے فریق کے خلاف ہو۔
- دونوں ممالک کے درمیان ہر سطح پر باقاعدہ رابطہ قائم رہے گا۔
- اس سمجھوتے پر فوری طور پر عملدرآمد شروع ہو جائیگا

معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد مسز اندرا گاندھی نے ڈھاکہ میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ بھارت اور بنگلہ دیش کا تعاون اور دوستی کا معاہدہ بالکل اسی قسم کا ہے جیسا گزشتہ سال بھارت اور سوویت یونین کے درمیان ہوا تھا۔ مسز اندرا نے یہ بھی کہا کہ اگر بنگلہ دیش کی خود مختاری کو خطرہ لاحق ہوا تو بھارت بنگلہ دیش کا پورا پورا ساتھ دے گا

بھارتی فوج کا آخری سپاہی "بنگلہ دیش" سے جانے کے چند دن کے اندر یہ معاہدہ کیا گیا۔ بنگلہ دیش سے بھارتی فوجوں کو اس لیے بلایا گیا کہ بنگالی عوام میں بھارت کے خلاف نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ سمجھنے لگے تھے کہ بھارت نے ان کے دیش کو اپنی نوآبادی بنا لیا ہے۔ چنانچہ بھارتی حکمرانوں نے مکاری اور عیاری سے کام لیتے ہوئے فوجوں کو بلوا لیا اور اپنا اثر برقرار رکھنے کے لیے دفاعی معاہدہ کر لیا۔

بھارتی جنگی دیوتا اگرچہ بنگالی عوام کی آزادی اور خود مختاری کے علمبردار بنے ہوئے ہیں لیکن یہ جھوٹ اور فریب ہے دراصل وہ مشرقی پاکستان میں استحصالی نظام برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں جب یحییٰ فوجی ٹولے نے مغربی پاکستان کے اجارہ دار سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی تو بنگالی عوام اپنے حق خود مختاری کے حصول اور مغربی بازو کے اجارہ دار سرمایہ داروں کے استحصال سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے پاکستانی فوج کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ چین نواز گوریلوں نے استحصالی نظام کو نیست و نابود کرنے کے لیے گوریلا جنگ کی طویل حکمت عملی اپنائی۔ فوج اور رضاکاروں کو بھاری جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ ان کی کامیابیوں اور سوشلسٹ پروگرام سے متاثر ہو کر عوام ان کے ہمنوا ہونے لگے۔

ان گوریلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بھارتی حکمرانوں

مجیب نے بنگلہ دیش کو بھارت کی نوآبادی بنا دیا ہے



کو خدشہ ہوا کہ اگر مشرقی پاکستان میں استحصالی نظام کا خاتمہ ہو گیا، سوشلسٹ معاشرہ قائم ہو گیا تو مغربی بنگال کے حریت پسندوں اور کسانوں کی تحریک نکسل باڑی کو تقویت ملے گی۔ مغربی بنگال بھارت کے استحصالی طبقوں کے چنگل سے آزاد ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے بنگلہ دیش کی تحریک کو اپنے کنٹرول میں لینے کے لیے مشرقی پاکستانی عوام کی آزادی اور خود مختاری کی "پرزور" حمایت کی۔ مکتی باہنی کے گوریلوں کو تربیت دینے کے علاوہ بھارتی علاقوں میں اڈے بنانے کی اجازت بھی دے دی۔ مکتی باہنی تو بھارتی حکمرانوں کے جھانسے میں آ گئی لیکن چین نواز گوریلے جو ان کے طبقاتی کردار سے بخوبی واقف تھے جھانسے میں نہیں آئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان کے عوام داؤد اور ولیکا کے استحصالی چنگل سے آزاد ہو کر ٹاٹا اور برلا کے استحصال کا شکار ہوں۔ وہ مشرقی پاکستان کے عوام کے گلے میں مغربی پاکستانی استحصالی طبقوں کی بجائے بھارت کے استحصالی طبقوں کی غلامی کا طوق ڈالنا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ استحصال سے پاک عوامی جمہوری معاشرے کے حامی تھے۔

جب بھارتی جنگی دیوتاؤں نے بزورِ طاقت مشرقی پاکستان پر قبضہ کر کے اپنی پٹھو حکومت قائم کر دی تو چین نواز گوریلوں نے اپنی جدوجہد تیز کر دی۔ انہوں نے عوام کے سامنے عوامی لیگ کے طبقاتی کردار کو بے نقاب کیا اور بتایا کہ عوامی لیگ نے بنگالی عوام کی آزادی اور خود مختاری کو نئی دہلی اور ماسکو کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ "انڈونیشیا آبزرور" کے مطابق شیخ مجیب کے دورۂ ماسکو سے "بنگلہ دیش" میں جدوجہد اور تیز ہو گئی ہے۔ اخبار لکھتا ہے کہ شیخ مجیب کے دورۂ ماسکو کا اعلان ہوتے ہی مولانا عبدالحمید خان بھاشانی نے حکومت پر کڑی نکتہ چینی کی اور زور دیا تھا کہ ماسکو جانے کی بجائے کروڑوں عوام پر توجہ دی جائے۔ جو بھوک افلاس اور غربت میں مبتلا ہیں جن کے پاس سر چھپانے کے لیے نہ کوئی جھونپڑی ہے اور نہ جسم پر کپڑا۔

انڈونیشیا آبزرور مزید لکھتا ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ نے بنگلہ دیش اور سوویت یونین کے گٹھ جوڑ کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ "بنگلہ دیش" کی تحریکِ آزادی میں ماسکو کی حمایت کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ملک سامراجی اور سوشل سامراج کی اجتماعی نوآبادی بن گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ! بھارت کے زیر سایہ بنگلہ دیش کے قیام کا مقصد چین کے گرد حصار قائم کرنا ہے"۔ ڈاکٹر طٰہٰ نے، جن کے گوریلوں کا اڈہ نواکھالی میں واقع ہے بتایا کہ "میرے گوریلوں نے کسانوں میں اراضی تقسیم کر دی تھی۔ لیکن عوامی لیگی حکومت نے وہ اراضی دوبارہ زمینداروں کو واپس کر دی"۔

اس کے علاوہ رائٹر کے نمائندے رام ہرش کے مطابق ۲۰ مارچ ۷۲ء کو شیخ مجیب الرحمٰن نے اعتراف کیا کہ "بنگلہ دیش" کے دیہاتوں میں کئی متوازی حکومتیں قائم ہو گئی ہیں اور حکومت کے خلاف گوریلوں نے جنگ شروع کر دی ہے"۔

گوریلوں کی اس جدوجہدِ آزادی کو کچلنے کے لیے بنگلہ دیش اور بھارت نے دفاعی معاہدہ کیا۔ سوویت یونین بھی اس معاہدہ کے حق میں تھا۔ کیونکہ روسی ہتھیار بھارت کی وساطت سے بنگلہ دیش جائیں گے اور اس طرح بنگلہ دیش میں سوویت اثرات مزید بڑھ جائیں گے۔ ۲۰ مارچ کو بی بی سی ریڈیو نے بھارت اور بنگلہ دیش کے دفاعی معاہدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"بنگلہ دیش میں گوریلوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے شیخ مجیب کی حکومت خائف تھی۔ بھارت بھی اس سے خوفزدہ تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ بنگلہ دیشی گوریلوں کی سرگرمیوں کا اثر مغربی بنگال کی نکسل باڑی تحریک پر بھی پڑے گا۔ نکسل باڑی تحریک مزید تیز ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ بھارتی حکمرانوں کو یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ جس طرح انہوں نے مشرقی پاکستان میں گوریلے بھیجے تھے اسی طرح بنگلہ دیشی گوریلے مغربی بنگال میں داخل ہو کر نکسل باڑی تحریک کو مضبوط بنا دیں گے ان خطرات سے نمٹنے کے لیے دفاعی معاہدہ کیا گیا"۔

بھارتی اور بنگلہ دیشی رجعت پسند، سوشل سامراج اور امریکی سامراج کی حمایت اور تائید سے عوام کی جدوجہد آزادی کو کچلنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن جس طرح ویت نام، کمبوڈیا، لاؤس اور کوریا میں یہ حربے ناکام ہو گئے اسی طرح برصغیر ہندو پاکستان میں ناکام ہوں گے کیونکہ عوام کی طاقت عظیم یا ناقابلِ شکست ہوتی ہے۔ ریاستی طاقت اسے دبا نہیں سکتی بلکہ عوام کی جدوجہد اور تیز ہوتی ہے۔ جس دن برصغیر استحصالی اور سامراجی چنگل سے آزاد ہو گیا۔ وہ دن سامراج کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ عظیم رہنما چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا ہے:

"آزاد چین کی طرح آزاد ہندوستان ایک دن دنیا میں سوشلسٹ اور عوامی جمہوری برادری کے ایک رکن کی حیثیت سے نمودار ہوگا۔ اس دن انسانی تاریخ میں سامراجی رجعت پسندی کے دور کا خاتمہ ہوگا"۔

بھارت اور بنگلہ دیش کا دفاعی معاہدہ

جنوب مشرقی ایشیا میں جدید توسیع پسندی کا نیا سلسلہ!

آغا مسعود حسین

نام نہاد بنگلہ دیش کی حکومت اور ہندوستان کے مابین "امن اور دوستی" کا ۲۵ سال کا معاہدہ ہوگیا ہے۔ یہ معاہدہ روسی طرز کا ہے جو گذشتہ سال ہندوستان اور روسی حکومت کے مابین ہوا تھا اور جس کا عملی مظاہرہ "بنگلہ دیش" کا وجود ہے تو دوسری طرف بنگلہ دیش کے محنت کشوں کی تحریک کو اس بین الاقوامی فوجی معاہدے سے ختم کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اب یہ بات تیسری دنیا کے عوام کے سامنے واضح ہوتی چلی جارہی ہے کہ جنوب ایشیا میں جدید توسیع پسندی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ہے جس کا مآل کار مقصد یہ ہے کہ اس خطہ پر دو اتحادی طاقت کے ذریعہ سامراجی استحصال کا ایک سلسلہ امن، دوستی اور تعاون کے نام سے شروع کیا جائے اور اس عظیم خطہ کے عوام کو ہمیشہ پس ماندہ رکھ کر سامراجی غلام بنا لیا جائے۔ بنگلہ دیش اور ہندوستان اس نئے دوستی اور امن کے معاہدے سے اس خطہ کو علاوہ اقتصادی استحصال کے جنگی خطے میں بدل کر تیسری دنیا کے عوام کی تحریک آزادی اور سامراج کے خلاف مزاحمتی تحریکوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

مشرقی پاکستان پر کامیاب یلغار کرکے ہندوستان کے حوصلے بڑھنے شروع ہوگئے ہیں۔ ہندوستان کا حکمران ٹولہ اس تازہ "فتح" کے ذریعہ بڑے گہرے سیاسی اور فوجی مقاصد کی تکمیل چاہتا ہے۔ مشرقی پاکستان پر قبضہ کرکے اس نے اپنی فوج کی اس ذلت کو دھونے کی کوشش کی ہے جو چین کے ہاتھوں ۱۹۶۲ء میں اٹھانی پڑی تھی۔ نیز ہندوستان کا حکمران طبقہ بین الاقوامی دنیا کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ جنوب مشرق ایشیا میں صرف چین ہی واحد بڑی ریاست نہیں ہے بلکہ ہندوستان بھی ہے جو ان فوجی فتوحات کے علاوہ بہت جلد نیوکلیر پاور بننے والی ہے۔ ہندوستان نے بڑی طاقت بننے کے کامپلیکس Complex میں نہ صرف جدید ہتھیاروں کی خرید میں بے پناہ قومی دولت ضائع کی ہے بلکہ صرف ہندوستان میں آج کل چالیس سے زیادہ فوجی ساز وسامان بنانے والی فیکٹریاں کام کر رہی ہیں۔ سکم، بھوٹان گوا وغیرہ میں ہندوستان نے چھوٹے پیمانے پر فوجی چھاؤنیاں قائم کر رکھی ہیں۔ جو بقول ایک ہندوستانی مبصر کے "کچھ دن بعد یہ فوجی اڈوں میں تبدیل ہوجائیں گے"۔ ادھر شیخ مجیب الرحمٰن کو اس فوجی معاہدے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ انہیں اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ چین کسی بھی وقت بنگلہ دیش پر حملہ کرکے اُن کی آزادی کو سلب کر سکتا ہے۔ حالانکہ شیخ صاحب اور بنگلہ دیش کے عوام جانتے ہیں کہ چین، ہندوستان اور روس کی مشرقی پاکستان پر مشترکہ حملے کے وقت اپنے علاقائی مفادات کے پیش نظر

سکم، بھوٹان اور گوا کی
فوجی چھاؤنیوں کو
فوجی اڈوں میں
تبدیل کرنے کا منصوبہ

مشرقی پاکستان پر حملہ کر سکتا تھا، لیکن چین اقوام کی آزادی اور سالمیت کا زبردست حامی ہے۔ وہ اس میں اصول کے پیش نظر خاموش رہا۔ شیخ مجیب الرحمٰن اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ "امن" کا ہونے والا معاہدہ دراصل ماسکو اور دہلی کے درمیان حال ہی میں ہونے والی گفتگو کا نتیجہ ہے۔ جس میں ماسکو نے دہلی سے اپنی روایتی دوستی کے نام پر درخواست کی کہ "ہندوستان کی مشترکہ ریاست" کے ساتھ معاہدہ کرکے روسی اثرات کی گرفت مضبوط کر دے تاکہ ایک طرف چینی خطرہ ٹل جائے تو دوسری طرف روس کے فوجی اڈوں کی تعمیر جلد ممکن ہوسکے۔

شیخ مجیب الرحمٰن شاید یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معاہدہ انہیں سیاسی طور پر بنگلہ دیش میں مضبوط بنا دے گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ابھی اس معاہدے کی سیاہی خشک بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ ترقی پسند اور اشتراکیت پر یقین رکھنے والوں نے عوامی لیگی، رجعت پسندوں اور سامراج کے ایجنٹوں کے خلاف مزاحمتی تحریکیں تیز کر دی ہیں۔ ایک فرانسیسی نامہ نگار کا کہنا ہے کہ "ڈھاکہ سے صرف چند میل دور کے فاصلے پر حریت پسندوں کی چھاپہ مار کارروائیاں بڑی تیزی سے جاری ہیں۔ مختلف گاؤں میں حریت پسندوں کا قبضہ ہے۔ بعض گاؤں میں سوشلزم نافذ کر دیا گیا ہے اور زمین کسانوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ سیاسی بے چینی کا عالم یہ ہے کہ بزرگ سیاستدان جس نے بنگلہ دیش کے قیام میں مجیب سے کچھ زیادہ ہی کردار ادا کیا ہے۔ اس بات کی شکایت کر رہا ہے کہ اُس کے بیانات اخبار میں نہیں چھاپے جاتے اور مجیب نے بنگلہ دیش کو ہندوستان کی ریاست بنا دیا ہے"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہندوستان اور نام نہاد بنگلہ دیش اپنے گہرے سماجی، معاشی اور مذہبی تفاوت کے ساتھ تیسری دنیا میں پیدا ہونے والی سیاسی بیداری کے شدید دباؤ کے تحت آنے والے انقلاب کو فوجی فتوحات اور نام نہاد امن اور دوستی کے معاہدوں سے روک سکتا ہے۔ ہندوستان جس انقلاب کو فوجی ہتھیاروں اور سامراجی معاہدوں سے روکے ہوئے ہے، وہ دراصل خلیج بنگال سے شروع ہوچکا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب ہندوستان کے عوام اپنے گہرے تفاوات کے ساتھ طبقاتی جدوجہد کے ذریعہ ایک روشن صبح طلوع کریں گے۔ جس میں فوجی معاہدوں کے برخلاف قوموں کے مابین حقیقی امن اور گہرے برادرانہ تعلقات ہوں گے اور جنگ مردہ سامراجی معاہدہ کی طرح کہیں دفن ہوجائے گی۔



غزل

سیّد عبد الحمید عدؔم

نہ ڈھونڈو — مسجدوں اور مندروں میں
خدا بِلتا ہے — بے رونق گھروں میں

جو دو اِک — نیک طینت راہ زن تھے
وہ جا کر مل گئے — رہبروں میں

بہار اس قہر سے آئی ہے — اب کے
کھِلے ہیں پھُول — بُلبل کے پروں میں

جو تیرے اَبروؤں کو — ہے ودیعت
کہاں وہ کاٹ — تیکھے خنجروں میں

اِنہیں دِل کیوں نہ — تفریحاً دکھا دیں
پری وش بھی ہیں کچھ — سوداگروں میں

محبت اور — مہ پاروں کی منڈی
نہ ڈھونڈو — موم کا دِل پتھروں میں

تمہیں بھرتی کروں — کِس محکمے میں ؟
کفن چوروں میں — یا بخیہ گروں میں

عدؔم انسان کی بیٹھک ہے — مناسب
کم عقلوں میں — کبھی دانش وروں میں

"ہندوستان کی ریاستیں" روس کا کیا مطلب ہے؟



رُوس ۱۹۶۰ء سے "ہندوستان کی جغرافیائی وحدت" کی فکر میں ہے

آغا مسعود حسین

آنجہانی نہرو اور وزیراعظم خروشیف کے درمیان بڑی گہری مفاہمت اور دوستی تھی۔ یہ دوستی سیاسی اغراض اور کچھ ذاتی مفادات پر مبنی تھی۔ نہرو، خروشیف کی جذباتیت اور سطحی سیاسی بصیرت" سے بخوبی واقف تھے۔ ایک دفعہ جب وہ ماسکو کا سرکاری دورہ کر رہے تھے۔ تو نہرو نے بڑے واضح الفاظ میں خروشیف سے کہا تھا ـــــ "ہندوستان ایشیا کی سب سے بڑی طاقت ہے" اور جب ۱۹۶۰ء میں خروشیف ہندوستان آئے۔ تو انہوں نے ایک جلسۂ عام میں کہا ـــــ "ہندوستان اپنے جغرافیائی وحدت کی تلاش میں ہے۔ میں ذاتی طور پر اور سوویت حکومت اپنی خارجہ پالیسی کے اہم تقاضوں کے تحت کشمیر کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ سمجھتی ہے۔ کشمیر حاصل کرنے کے بعد ہندوستان اپنے حقیقی جغرافیائی عمل کی طرف بڑھے گا۔"

۱۹۶۲ء میں نہرو نے خروشیف کی اس جذباتیت سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر بے پناہ اسلحہ اپنے "جغرافیائی وحدت" کے حصول کے لیے حاصل کیا اور جب وہ بے پناہ اسلحہ اور فوجی ساز و سامان حاصل کر چکے تو انہوں نے مدراس میں ایک عام جلسہ میں کہا ـــــ "آج کا ہندوستان ایشیا کی عظیم طاقت بن کر ابھر رہا ہے۔ ہم چین سے بھاری صنعتوں اور زراعت میں ترقی کے لحاظ سے بہت آگے ہیں۔" اور اس غرور نے نہرو کو یہ کہنے پر مجبور کیا۔ ہندوستان کی فوجوں کو چاہیئے کہ شمال میں اپنی پوزیشن مضبوط کریں۔ ہم اپنی چوکیوں کو چینی فوج سے لینے کا حق رکھتے ہیں" ـــــ اور اس لمحے چین کے ہاتھوں ایشیا کا یہ ملک عبرتناک شکست کھا چکا تھا اور نہرو اس صدمہ کی تاب نہ لا کر مر چکے تھے۔

نہرو کے مرنے کے بعد اور ہندوستان اور چین کے مابین شدید اختلاف اور فوجی تصادم کے بعد سوویت سوشل سامراج کی پالیسی ہندوستان کی طرف تیزی سے جھکنے لگی۔ ڈاکٹر گینکوسکی جو "ہندوستانی ریاستوں" کے شعبے کے صدر ہیں، نے ایک بڑا دلچسپ مقالہ سپریم سوویت کے سامنے پیش کیا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ـــــ "ہندوستان مشرقی پاکستان سے لے کر افغانستان اور کشمیر سے لے کر بھوٹان کی شمالی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے اور ان میں آباد ملک (برما سیلون افغانستان اور پاکستان وغیرہ) مصنوعی ملک ہیں۔ اس لیے ہندوستان ان جغرافیائی وحدت کو حاصل کرنے کا پورا پورا حق رکھتا ہے ـــــ۔"

ڈاکٹر گینکوسکی کے اس مقالہ کے بعد ہی سے سپریم سوویت نے یہ فیصلہ کیا کہ "آئندہ سے برصغیر پاک و ہند کہنے کے بجائے "ہندوستان کی ریاستوں" کا تاریخی لفظ استعمال کیا جائے گا جو ایک طرف روس کی خارجہ پالیسی کا مظہر ہوگا تو دوسری طرف ہندوستان کو جغرافیائی وحدت کی تلاش آسان ہو جائے گا۔" اس مقالہ کے تھوڑے ہی دن بعد ڈاکٹر گینکوسکی اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ تاشقند میں مصر کے علماء سے باتیں کر رہے تھے۔ گفتگو کے دوران ایک مصری علماء نے کہا۔ "آپ کے اس مقالہ کو پڑھ کر مجھے یہ احساس ہو چلا ہے کہ آئندہ آپ جو مقالہ لکھیں گے اس میں آپ یہ بتائیں گے کہ آج کا سوویت یونین ایک سامراجی ملک ہے جس نے ماضی میں مسلم ایشیائی ملکوں کو، جو روس کی جمہوری ریاستیں ہیں اور سوویت یونین کا حصہ ہیں، در اصل آزاد ملک تھے جہاں کی تہذیب و ثقافت آج تک اپنے منفرد اور آزاد ہونے کا ثبوت بہم پہنچا رہی ہے۔" ڈاکٹر گینکوسکی کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا جو کے جی بی کا اہم رکن تھا۔ دونوں نے تھوڑی دیر کے لیے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کیں اور پھر گینکوسکی نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا ـــــ "ہم ماضی کی تاریخ، جو در اصل زار سامراج کی تاریخ ہے، کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم نے ان مسلم ریاستوں کو آزاد ہونے کا آئینی حق دیا ہے وہ چاہیں تو آزاد ہو سکتی ہیں!" مصری علماء نے فوراً ہی ایک کتاب گینکوسکی کے حوالے کی جس میں تاشقند میں علیحدگی کی تحریک میں حصہ لینے والوں کو کس طرح نیست و نابود کیا گیا تھا۔ گینکوسکی نے دوبارہ اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور کہا ـــــ "یہ سی آئی اے کا کارنامہ ہے ـــــ!" محفل برخاست ہو گئی اور ان مصری علماء کو ایک حفاظتی دستے کے گھیرے میں ایئرپورٹ بھجوا دیا گیا۔

کوسیجن نے "ہندوستان کی ریاستوں" کے مابین جس خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا ہے وہ در اصل روسی سوشل سامراج کی توسیع پسندی کی پالیسی کا ایک اہم حصہ ہے جس کے ذریعے وہ ہندوستان کو ایک مصنوعی طور پر بڑا ملک بنا کر چین کے خلاف تیار کرنا چاہتا ہے۔ بنگلہ دیش کا قیام اور اس کے بعد مغرب کی سرحدوں پر نئی جغرافیائی لکیروں کا اضافہ پاکستان کے اس حصے کو بھی ختم کرنے کا روسی منصوبہ اب پاکستانی عوام کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیئے۔ تیسری دنیا کے عوام کو اپنی آزادی کا سب سے بڑا خطرہ روسی سوشل سامراج سے ہے جو آج بھی ان ممالک کی سرحدوں پر فوجی یلغاروں کے ذریعے تبدیلیوں کا سب سے بڑا نقیب ہے۔





تحریکِ پاکستان
کی مخالفت سے لے کر
بہاریوں کی منتقلی تک
مولویوں کا کردار



بنگالی بہاریوں سے اخلاقی طور پر برتر ہیں (جماعتِ اسلامی)

محمد اسلام

۱۹۴۰ء میں جب مولوی فضل الحق نے لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں پاکستان کی قرارداد پیش کی تو مشرقی بنگال کے مولویوں نے ان پر لعن طعن کی بوچھاڑ کی۔ تقسیم سے قبل خصوصاً مشرقی بنگال پر ایک طرح سے مولویوں کا راج تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی بنگال کے ہندوؤں نے وہاں کے مسلمانوں کو تعلیم سے بے بہرہ رکھنے کی منظم کوشش کی تھی اسی لیے یہاں کے مسلمانوں کو توہم پرستانہ مذہب سے بہت زیادہ لگاؤ ہے پورے بنگال میں مولویوں کا طوطی بولتا تھا۔ عوام کی زندگی کا کوئی مسئلہ بغیر مولوی کی مرضی کے طے نہیں ہو سکتا تھا۔ مولویوں کا غالب طبقہ پاکستان کا سخت دشمن تھا اور قیام پاکستان کے سلسلے میں ہر قسم کے روڑے اٹکانا ان کا مذہبی فریضہ تھا انہوں نے ہندو ساہوکاروں اور زمینداروں سے سازباز کی ہوئی تھی اور کسی طرح بھی مشرقی بنگال تک پاکستان کی آواز نہیں پہنچنے دیتے تھے لیکن پاکستان کی تحریک میں ایسی جاذبیت تھی کہ ان حضرات کی منظم سازشوں کے باوجود مشرقی بنگال کے عوام تک یہ آواز پہنچ ہی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں کے ہندوؤں اور انگریز حکمرانوں نے عوام کو اس قدر شکنجہ میں کسا ہوا تھا کہ وہ ان کی مرضی کے خلاف ایک لفظ زبان سے نہیں نکال سکتے تھے سیدھے سادے عوام پر بیک وقت تین جگر سوز عذاب مسلّط تھے۔ انگریز ہندو اور مولوی: جس طرح مظلوم بنی اسرائیل کے سر پر فرعون قارون اور ہامان سوار تھے۔

ان دنوں بنگال کے مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز کلکتہ تھا۔ ان کی کوششوں سے عوام کا ایک طبقہ انگریز اور ہندو کے شکنجہ سے تو نکل گیا لیکن مولوی کے آہنی شکنجہ سے چھٹکارا نہ پا سکا۔ عوام کی جہالت، سادہ دلی اور شدید مذہبی رجحانات کی وجہ سے نہ صرف مقامی مولوی عوام کو لوٹ رہے تھے بلکہ ہندوستان کے تقریباً ہر گوشے کے مولوی مغربی بنگال پہنچ کر خودساختہ مذہب کی تبلیغ کے نام پر اپنی اپنی جھولیاں بھر بھر کر واپس آیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۴۶ء سر پر آ پہنچا۔ الیکشن کا اعلان ہوا جو پاکستان کے نام



> "غیر ملکی بہاری
> بنگال کے
> سینے پر بوجھ
> بنے ہوئے ہیں"

پر لڑا جا رہا تھا۔ الیکشن کے سلسلے میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بہت سے مسلم لیگی لیڈروں نے مشرقی بنگال کا دورہ کیا اور لوگوں پر پاکستان کی اہمیت واضح کی مسلم لیگی لیڈروں کا اثر اور عوام کا پاکستان کی حمایت پر آمادہ دیکھ کر ہندوؤں نے اپنے اجیر مولویوں کو مسلم لیگی لیڈروں کا زور توڑنے کے لیے بھیجا۔ روحِ میر جعفر کے ان پیکروں نے اپنی تقریروں میں پاکستان کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا۔ اور ہر ناحربہ استعمال کیا اور ان پر کفر کے فتووں کی بوچھاڑ شروع کر دی پاکستان کی تحریک کو انگریزوں کا شگوفہ بتایا اور ہر امکانی کوشش کی کہ یہ تحریک مقبول نہ ہونے پائے لیکن عوام انگریز اور ہندو کے ہاتھوں اتنے تنگ آ چکے تھے کہ ان کی یہ کوششیں ناکام ہو گئیں۔ عوام نے مسلم لیگ کو ووٹ دیئے اور ۱۹۴۶ء کے مرکزی اسمبلی کے الیکشن میں بنگال کے تمام کے تمام ممبر نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ ان کے حریفوں کی ضمانتیں بھی ضبط ہو گئیں۔ اپنا یہ انجام دیکھ کر مولویوں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ کہ اب اللہ و رسولؐ کے نام پر مفت کی روٹی نہیں مل سکے گی بلکہ اب محنت کر کے پیٹ بھرنا ہو گا۔ دوسری طرف یہ مصیبت بھی ان پر آ پڑی کہ انہوں نے جن ہندو ساہوکاروں اور زمینداروں سے روپے لے کر عیش اڑائے تھے وہ بھی ان سے ناخوش ہو گئے اور انہوں نے تمام وظائف بند کر دیئے۔ مولویوں کو اس سے سخت دھچکا لگا۔ انہوں نے ہندو مہاجنوں کو سمجھایا کہ الیکشن میں اتفاقی طور پر ہمیں شکست ہوئی ہے۔ یہاں کے مسلمان کی جنت ہمارے ہاتھ میں ہے یہ ہم سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ ان کے دلوں پر اب بھی ہمارا ہی راج ہے۔

اگر تم ہماری مدد جاری رکھو تو ہم قیام پاکستان کو روکنے

مولویوں نے مسلم لیگ کا جلسہ سننے والوں کو کافر اور بے دین کہا



کے لیے عوام کو پھر ایک مرگھٹ پر جمع کر دیں گے۔ ہندو گو کچھ مایوس تھا۔ لیکن بغیر مولوی کے وہ ایک قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس لیے اس نے امید کی آخری کرن دیکھ کر پھر اپنی تجوریوں کے پٹ کھول دیئے اور مولویوں نے پھر اپنی تنظیم کر کے عوام پر دھاوا بول دیا۔ سب سے پہلا حملہ نواکھالی پر کیا گیا۔ پورے بنگال میں نواکھالی مولویوں کا زبردست قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ایک بہت بڑا جلسہ کیا گیا اور تمام مولویوں نے متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا کہ مسلم لیگ میں شریک ہونے، مسلم لیگ کو ووٹ دینے اور مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان کا ساتھ دینے والے فاسق، فاجر کافر اور منافق ہیں۔ اس جلسے کی سختی کا اندازہ لگائیے کہ انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ مرکزی اسمبلی کے الیکشن میں جن لوگوں نے مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دیئے تھے وہ سب سے پہلے کافر ہیں اور دین سے خارج ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ان کی بیویاں ان پر حرام ہو چکی ہیں اگر وہ صدقِ دل سے توبہ کر کے دوبارہ مسلمان نہ ہو جائیں تو ایسے میاں بیوی میں علیحدگی کرا دی جائے گی۔ اس جلسہ کو مولوی نے اپنی کامیابیوں کا پیش خیمہ قرار دے کر بڑے پیمانے پر پاکستان کی مخالفت شروع کر دی۔

مولویوں کی مخالفت کے علی الرغم جب پاکستان بن گیا تو ان حضرات نے پاکستان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو عجمیوں نے عرب کے ساتھ کیا تھا۔ وہ مولوی جنہوں نے ہر قدم پر پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ وہ پھر پاکستان کے دوست بن کر سامنے آئے۔ تقسیم کے بعد ان کا دھندا بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے پاکستان کا رُخ کیا۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کے لیے یہ سوچا کہ اگر تمام ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو اس طرح اللہ اور رسولؐ کے نام پر ایک متحدہ محاذ بن سکتا ہے۔

اس زمانے میں خواجہ ناظم الدین مرحوم مشرقی بنگال کی مسلم لیگی حکومت کے سربراہ تھے۔ یہ طبعاً مذہب پرست تھے اس لیے مولویوں نے ان کے دورِ حکومت میں بڑا سر اٹھایا۔ خواجہ ناظم الدین کے بعد نور الامین صاحب مشرقی بنگال کے وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ انہوں نے مولویوں کو کوئی لفٹ نہ دی۔ نور الامین کے حریف مولوی فضل الحق صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر مولویوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اتفاق سے نور الامین صاحب سے بعض سیاسی غلطیاں سرزد ہو گئیں اس لیے طالب علموں کا ایک طبقہ ان کا مخالف ہو گیا اور یہی طبقہ مشرقی پاکستان کی سیاست پر ہندو کی زیرِ نگرانی آگے بڑھتا چلا گیا اور اس طرح مولویوں کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی کیونکہ قیادت اب طلباء کے ہاتھ آ چکی تھی۔

جماعتِ اسلامی نے شروع سے مشرقی بنگال میں قدم جمانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ لیکن دوسرے مولویوں کے آگے "ماڈرن مُلّا" کی ایک نہ چلی۔ تقسیم کے بعد ڈھاکہ کی ایک سڑک پر جماعتِ اسلامی نے صرف ایک بورڈ لگا رکھا تھا۔ اس جماعت کی نامقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مشرقی پاکستان کی جماعتِ اسلامی کو صوبہ بھر میں ایک ایسا مقامی آدمی بھی نہ مل سکا جو وہاں جماعت کی امارت کے فرائض انجام دیتا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے لاہور سے ایک عدد امیر چوہدری علی احمد خان کو درآمد کیا گیا۔ الیکشن کے زمانے میں جماعتِ اسلامی نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر انہیں وہاں کوئی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

اسی عرصہ میں انتخابات پھر سر پر آ گئے تو مولوی فضل الحق صاحب کو پھر مولویوں کی ضرورت پڑی۔ مولوی جو اس انتخاب کے موقع پر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ اس سے مولویوں کو نقصان پہنچا۔ مجبور ہو کر فضل الحق صاحب نے جمعیت العلمائے اسلام کے ایک لیڈر مولوی اطہر علی کو مولویوں کی ایک نئی پارٹی بنانے کا مشورہ دیا اور اس طرح نظامِ اسلام پارٹی بنانے کا مشورہ دیا۔ اور اس طرح نظامِ اسلام پارٹی کی بنیاد پڑی۔ اس پارٹی میں وہی لوگ شریک تھے جو مولوی اطہر علی صاحب کے معتقد اور مرید تھے۔ مولوی اطہر علی صاحب اس کے صدر اور مولوی مصلح الدین صاحب جنرل سیکرٹری بن گئے۔ فضل الحق صاحب نے اس زمانہ میں ایک اور دستہ منظم کیا اور اس کا نام کرشک سرامک پارٹی رکھا۔ مسلم لیگ کو شکست دینے کے لیے جب عوامی لیگ، کمیونسٹ پارٹی، کرشک سرامک پارٹی اور گن تری دل نے مل کر جگتو فرنٹ بنایا تو متحدہ محاذ کے نام پر مولوی اطہر صاحب نے بھی اس میں شرکت کر لی۔ اس انتخاب میں اطہر علی صاحب کا کچھ جھگڑا ہو گیا۔ اور انہوں نے اپنے امیدوار علیحدہ کھڑے کر دیئے۔ مسلم لیگ تو اس انتخاب میں ہار گئی لیکن نظامِ اسلام پارٹی کو اس سے بھی بدتر شکست ہوئی۔

الیکشن میں متحدہ محاذ جیت گیا اور اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان میں قتلِ عام شروع ہو گیا۔ چنانچہ متحدہ محاذ کی حکومت ختم کر کے گورنر راج قائم کر دیا گیا۔ صوبے کے گورنر میجر جنرل اسکندر مرزا مقرر ہوئے۔ ابھی انہوں نے اقتدار سنبھالا ہی تھا کہ صوبے کے آٹھ اضلاع میں تاریخی سیلاب آیا۔ سیلاب کی تباہ کاریاں ختم بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ خدائی عذاب گشتی شفا خانے والے "صالحین" کی شکل میں اچانک نمودار ہوا۔ انہوں نے نامعلوم کس طرح ہزاروں من غلہ اور سینکڑوں گانٹھیں کپڑے کی حاصل کر کے ان کی تقسیم شروع کر دی اور ساتھ ہی ساتھ اپنا پراپیگنڈا بھی شروع کر دیا لیکن بنگال کے مظلوم عوام ان مولویوں کے ہاتھوں اتنے تنگ آ چکے تھے کہ جماعتِ اسلامی کی امداد بھی کچھ کام نہ آ سکی۔

مایوسی کے عالم میں جماعتِ اسلامی نے مہاجرین پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے لیکن جب اسے مہاجرین نے بھی کوئی لفٹ نہ دی تو پھر یہ مقامی باشندوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ جہالت کا خاصہ یہ ہے کہ جاہل کا متعصب ہونا لازمی ہے۔ وہ وہاں کے بہاریوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ جماعتِ اسلامی نے جب یہ بھانپ لیا تو اس نے مقامی لوگوں کی دلی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے مقامی اور غیر مقامی کے مسئلہ کو خوب ہوا دی اور بنگالی بہاری جھگڑے پیدا کر کے اپنا اُلّو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔

۱۹۵۵ء میں جماعتِ اسلامی سید پور (ضلع رنگپور) کے آرگنائزر اسعد گیلانی صاحب کی ایک سازش پر سے نقاب اٹھ گیا جس پر مشرقی پاکستان کے مہاجرین نے سخت غم و غصہ کا اظہار کیا۔ اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسعد گیلانی صاحب جنہیں مرکزی جماعتِ اسلامی کی طرف سے حلقۂ شمالی بنگال کا آرگنائزر مقرر کیا گیا تھا، انہوں نے جماعتِ اسلامی کے آرگن "چراغِ راہ" کراچی کے جنوری ۱۹۵۵ء کے شمارے میں مکتوب بنگالہ کے عنوان سے ایک مضمون سپردِ قلم فرمایا

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

محکمہ ٹیلیگراف اور ٹیلیفون —— مزید کہانیاں



بچت اور کفایت شعاری کے نام پر

نان گزیٹڈ عملہ کی چھانٹی کا منصوبہ

الفتح رپورٹ

پاکستان کی اقتصادی بدحالی اور مفلوج معیشت کے پیشِ نظر مرکزی حکومت نے بچت اور کفایت شعاری کے احکامات جاری کیے۔ تمام سرکاری محکموں کو ہدایات دی گئیں اور وہ اپنے بجٹ میں کمی کریں۔ کسی بھی صورت میں نئی بھرتی نہ کی جائے۔ عوضی (LEAVE VACANCY) پر ملازم نہ رکھیں بلکہ موجودہ عملہ میں بھی کمی کریں۔ ان احکامات کے اجراء پر عوام نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ان کا نشانہ درجہ سوم اور چہارم کے ملازمین ہی ہوں گے یہ غریب ملازم جو بمشکل جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہیں اس کی زد میں آئیں گے۔ فاضل قرار دے کر برطرف کر دیئے جائیں گے۔ بھاری بھاری تنخواہیں پانے والے افسر صاف بچ جائیں گے۔ یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ ٹیلی گراف اینڈ ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کی اسٹینڈنگ اکانومی کمیٹی نے فاضل عملہ کی جو فہرست ۷ مارچ ۱۹۷۲ء کو مرتب کی۔ اس میں درجہ سوم اور چہارم کے ملازمین کی خاصی بڑی تعداد کو فاضل دکھایا گیا۔ جب کہ چند افسر فاضل قرار دیئے گئے۔

اس رپورٹ کے مطابق فاضل عملہ کو برطرف کرنے سے محکمہ ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کو ایک لاکھ ۴۸ ہزار ۱۴۰ روپے کی سالانہ بچت ہو گی۔ اکانومی کمیٹی نے درجہ سوم اور چہارم کے ملازمین پر ہی تلوار چلائی ہے۔ افسر برائے نام شامل ہیں۔ اس کے ثبوت میں صرف ڈائرکٹر جنرل ٹی اینڈ ٹی کے دفتر میں فاضل قرار دیئے جانے والے عملہ کی فہرست ذیل میں دی جا رہی ہے

ڈائرکٹر	۲	ڈویژنل انجینئر	۲
اسسٹنٹ انجینئر	۳	سپرنٹنڈنٹ	۲
اسسٹنٹ	۱۳	اپر ڈویژن کلرک	۱۱
لوئر ڈویژن کلرک	۱۲	اسٹینو گرافر	۲
اسٹینو ٹائپسٹ	۵	ڈرافٹسمین	۲

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈائرکٹر اور ڈویژنل انجینئر کی جن پوسٹوں کو فاضل قرار دیا گیا ہے وہ حال میں منظور ہوئی تھیں اور ابھی تک انہیں پُر نہیں کیا گیا جب کہ درجہ سوم کی جن پوسٹوں کو فاضل بتایا گیا وہ بہت پرانی ہیں اور ایک عرصہ قبل پُر ہو چکی ہیں۔ اکانومی کمیٹی نے جو ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے اعلیٰ حکام پر مشتمل ہے، نہایت مکاری اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے درجہ اول کی ان گزیٹڈ پوسٹوں کو فاضل بتایا جو ابھی تک پُر نہیں ہوئی ہیں۔ بالفاظِ دیگر درجہ اول کے افسر اتنے ہی رہیں گے، جتنے پہلے تھے۔ البتہ درجہ سوم کے ۸۴ ملازمین برطرف کر دیئے جائیں گے۔

محکمہ ٹیلی گراف اور ٹیلی فون میں افسروں کی ایک فوج ظفر موج ہے، بے شمار افسر ہیں، دن بھر دفتر میں بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہیں، چائے پیتے ہیں اور گپ شپ لڑا کر اپنے گھروں کا راستہ پکڑتے ہیں۔ بعض افسر ایسے بھی ہیں جنہیں پورے سال میں ایک فائل پر بھی دستخط کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ۱۹۶۲ء سے اب تک افسروں کی تعداد میں دو سو گنا اضافہ ہو چکا ہے جب کہ نان گزیٹڈ عملہ میں صرف ۵ فیصد کا اضافہ ہوا۔ آیئے افسروں کی تعداد کا تفصیل سے جائزہ لیں۔

ڈائرکٹر جنرل	۱	اسسٹنٹ ڈویژنل انجینئر	۵۹
چیف انجینئر	۳	اسسٹنٹ انجینئر	۳۸۶
جنرل منیجر	۴	چیف اکاؤنٹس آفیسر	۱
ڈائرکٹر	۲۹	ڈائرکٹر آف اکاؤنٹس	۱
ڈویژنل انجینئر	۱۱۸	اسسٹنٹ چیف اکاؤنٹس آفیسر	۲
		اکاؤنٹس آفیسر	۱۵۵

بھارت پاکستان سے پانچ گنا بڑا ملک ہے۔ ٹیلی فونز کی تعداد بھی چھ گنا ہے۔ لیکن پاکستان ٹیلی گراف اینڈ ٹیلیفون ڈیپارٹمنٹ میں بھارت سے پانچ گنا زیادہ افسر ہیں۔ تقسیم برصغیر ہند و پاک سے پہلے صرف پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف ڈیپارٹمنٹ ہوتا تھا۔ اس کا سربراہ ڈائرکٹر جنرل ہوتا تھا۔ ایک چیف انجینئر، دو ڈائرکٹر اور ایک ڈائرکٹر آف اکاؤنٹس اس کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔ کراچی سے پشاور تک کی دیکھ بھال صرف ایک جنرل منیجر کرتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اقربا پروری اور دوست نوازی کا دور شروع ہوا افسروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ دورِ ایوبی میں افسروں کو سیاسی رشوتیں دی گئیں۔ ان کی تعداد میں کسی ضابطہ اور قانون کا خیال کیے بغیر اضافہ کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف ڈیپارٹمنٹ کو دو محکموں میں تقسیم کیا گیا۔ پوسٹل سروس کا علیحدہ محکمہ بنا دیا گیا۔ ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کا علیحدہ، پھر افسروں کی بھرتی شروع ہوئی۔ ایک کی بجائے تین چیف انجینئر بنا دیئے گئے ایک جنرل منیجر کی بجائے چار جنرل منیجر، پانچ کی بجائے ۱۵۵ اکاؤنٹس آفیسر ہو گئے۔

افسروں کی تعداد میں اضافہ کس طرح ہوا؟ اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ایس اے ستار جنرل منیجر تھے سعودی عرب کی حکومت نے ان کی خدمات مستعار لیں۔ ان کی غیر حاضری میں ان سے جونیئر بی کے نذیر چیف انجینئر بنا دیئے گئے۔ جب ایس اے ستار واپس آئے تو بی کے نذیر سے سینئر ہونے کی وجہ سے چیف انجینئر کی حیثیت سے ان کا تقرر کیا گیا اور بی کے نذیر کے لیے تنزلی کے احکامات جاری کر دیئے گئے لیکن بی کے نذیر نے انہیں چارج دینے سے انکار کر دیا اور دفتر میں تالا لگا کر اسی دن ڈھاکہ کے لیے پرواز کر گئے۔ وہاں وزیر مواصلات سے ملے۔ وزیر موصوف سے ترقی کا پروانہ لے کر دوسرے دن کراچی واپس آ گئے۔ وزیر مواصلات نے کسی ضابطہ اور قانون کے بغیر انہیں ترقی دے دی۔ اس طرح ایک اور چیف انجینئر کا اضافہ ہو گیا۔

پشاور ٹیلی فون ڈویژن میں ۱۹۷۱ء میں کل ساٹھ ٹیلی فون لگے۔ اس پر ایک ڈائرکٹر اور ایک ڈویژنل انجینئر

ڈائریکٹریٹ جنرل کے افسروں کے دوروں کا خرچ ــــ چار لاکھ روپے سالانہ

کا اضافہ کر دیا گیا۔ حالانکہ محکمہ کے قانون اور ضابطہ کے مطابق سولہ ہزار ٹیلیفون پر ایک ڈائرکٹر اور پانچ ہزار ٹیلیفون پر ایک ڈویژنل انجینئر ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان میں اس وقت ایک لاکھ چوالیس ہزار ٹیلیفون کام کر رہے ہیں۔ محکمہ کے ضابطہ اور قانون کے اعتبار سے ۹ ڈائرکٹر اور ۲۹ ڈویژنل انجینئر ہونے چاہئیں جب کہ اس وقت ۲۹ ڈائرکٹر اور ۱۱۸ ڈویژنل انجینئر ہیں۔

اگر بچت اور کفایت کرنی ہے تو حکومت کو چاہیئے کہ وہ درجہ سوئم اور درجہ چہارم کے ملازمین میں کمی کرنے کے بجائے افسروں میں کمی کرے۔ کیونکہ افسروں کی تنخواہیں بہت زیادہ ہیں۔ ایک چیف انجینئر گیارہ کلرکوں کے برابر تنخواہ لیتا ہے چند افسروں کی ابتدائی تنخواہ حسب ذیل ہے۔

چیف انجینئر ــــــــ -/۲۲۰۰ روپے

ڈویژنل انجینئر ــــــــ -/۹۵۰ روپے

اسسٹنٹ انجینئر ــــــــ -/۴۹۰ روپے

افسر نہ صرف بھاری تنخواہیں لیتے ہیں بلکہ مدعیٰ‌ٔ انیال بھی زیادہ کرتے ہیں۔ جھوٹے اور جعلی میڈیکل بل پیش کر کے بھاری رقمیں بٹورتے ہیں۔ ڈائرکٹر جنرل کے دفتر والوں نے صرف چھ ماہ (۳۰ جون ۱۹۷۱ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ء) میں چار لاکھ گیارہ ہزار روپے کے میڈیکل بل وصول کیئے۔ یہ رقم زیادہ تر افسروں نے وصول کی ہے۔ کیونکہ ان پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ جتنا چاہیں بل پیش کر دیں۔ اس کے برخلاف درجہ سوم اور درجہ چہارم کے ملازمین کو کچھ نہیں ملتا۔ اس لیے ان کا مطالبہ ہے کہ تنخواہ میں میڈیکل شامل کر دیا جائے اس سے حکومت کو تقریباً ساٹھ فیصد کی بچت ہوگی۔

ڈائرکٹر جنرل آفس کے افسر دوروں، سیر و تفریح کے بہت شوقین ہیں اور کیوں نہ ہوں، جب جیب میں سے کچھ نہیں جاتا "اِلٹا ڈیلی الاؤنس" بل جاتا ہے۔ شادی میں شرکت کرنی ہو، یا موسم گرما میں مری کی برف پوش پہاڑیوں کا نظارہ کرنا ہو، افسر سرکاری کام نکلوا لیتے ہیں۔ "نام سرکاری کام" کا ہوتا ہے۔ لیکن مقصد کسی شادی کی تقریب میں شرکت کرنا ہوتا ہے۔ یا سیر و تفریح، آئے دن پنڈی اور اسلام آباد کے دورے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک سال (یکم جولائی ۱۹۷۰ء تا ۳۰ جون ۱۹۷۱ء) میں ۳ لاکھ ۸۵ ہزار ۱۸۱ روپے کے "ٹی اے" بل وصول کیے گئے۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔

شعبۂ انتظامیہ ــــــــ ۱۲۸۴۹۰ روپے

شعبۂ ترقیاتی ــــــــ ۲۱۴۷۸۲ روپے

شعبۂ منصوبہ بندی ــــــــ ۴۲۶۰۹ روپے

اسلام آباد میں ڈائرکٹر جنرل ٹی اینڈ ٹی کا نیا دفتر اور اس کے عملہ کے لیے ۵۴ کوارٹر تعمیر ہو چکے ہیں۔ اپریل کے دوسرے ہفتے تک یہ دفتر اور کوارٹر محکمہ کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ ان کی تعمیر پر دو کروڑ ۸۵ ہزار روپے کی لاگت آئی ہے۔ لاکھوں روپے کا زرِ مبادلہ بھی اس کام میں شامل ہے۔ لیکن بعض خود غرض اور مفاد پرست اعلیٰ حکام اسلام آباد جانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اسلام آباد میں جانے سے دورے کم ہو جائیں گے۔ اب تو وزارت کی میٹنگوں میں شرکت کے بہانے اسلام آباد کے دورے ہوتے رہتے ہیں اور لاکھوں روپے کے ٹی اے بل وصول کر لیے جاتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے وزیر مواصلات اور سیکرٹری کو تار دیئے ہیں کہ عملہ اسلام آباد جانا نہیں چاہتا۔ حالانکہ عملہ وہاں جانے کے لیے تیار ہے اسلام آباد میں منتقلی سے نہ صرف غیر ضروری دوروں پر خرچ ہونے والی رقم کی بچت ہوگی بلکہ محکمہ کی اسپیشل ٹراک پر جو روزانہ کراچی سے اسلام آباد سے کراچی آتی ہے، دو لاکھ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے۔ اس کی بچت ہو گی اس کے علاوہ عملہ کو آمد و رفت کا جو الاؤنس دیا جاتا ہے وہ بھی بچ جائے گا۔ کیونکہ کوارٹر دفتر سے بالکل نزدیک ہیں۔ حال ہی میں مرکزی حکومت کے تیرہ سو سے زائد افسروں کو برطرف کیا گیا ہے۔ لیکن محکمہ ٹیلی گراف اور ٹیلیفون میں بہت سے بدعنوان افسر باقی ہیں۔ حکومت ان کے بدعنوان اور بددیانت ہونے کا اندازہ صرف ان کے معیارِ زندگی سے ہی لگا سکتی ہے۔ ایک اسسٹنٹ انجینئر کو ابتدائی تنخواہ ۴۹۰ روپے ملتی ہے۔ لیکن تمام اسسٹنٹ انجینئروں کے پاس ذاتی گاڑیاں ہیں۔ اس ہوشربا گرانی کے زمانے میں ۴۹۰ روپے تنخواہ پانے والا شخص موٹر کس طرح رکھ سکتا ہے؟ اس کا کھوج لگانا حکومت کا کام ہے۔



بدعنوان افسروں کی چھٹی حس بھی بہت تیز ہوتی ہے

افسروں کو محض ریٹائر کر دینا کوئی کارنامہ نہیں ہے

سامری (راولپنڈی)

آخرکار حکومت کو تیرہ سو افسران کو ریٹائر کرنا پڑا۔ ان بڈھے کھوسٹ افسران کی سب سے بڑی بدعنوانی تو یہ تھی کہ یہ نئے لوگوں کے لیے سیٹیں چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے اور اس طرح سے ان کی مفاد پرستی، بے روزگاری کا کسی حد تک سبب بنی ہوئی تھی۔ لیکن حکومتِ وقت اور جناب بھٹو صاحب سے یہ سوال کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ریٹائر ہونے والے افسران کو بدعنوانی کے لیبل کے ساتھ سبکدوش کرنا نہ صرف اکثریت کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ ہم لوگوں میں جنہوں نے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور افسر شاہی کے ہزاروں ظلم سہہ کر بھٹو صاحب اور ان کی پارٹی کو کامیاب کرایا ہے۔ یہ تاثر و احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تک "کھو الف کروب" کی پالیسی پر عمل کر کے ہمیں حقائق سے دور رکھا جا رہا ہے۔

افسروں کی ریٹائرمنٹ ایک "روٹین ورک" ہے اور اس کو اس تاثر کے ساتھ تشہیر کرنا کہ جیسے بدعنوانی ختم کی جا رہی ہو سراسر غلط ہے۔ ریٹائر ہونے والے افسران میں اکثر وہ لوگ ہیں جو اصولی طور پر ریٹائر ہونے چاہیئے تھے۔ جہاں تک بدعنوانی کا تعلق ہے تو یہ لعنت بدستور اور بڑے کر و فر کے ساتھ موجود رہے گی۔ کیونکہ اصل بدعنوان افسر جو بدعنوانیوں کے باعث ہیں۔ وہ اپنی سیٹوں پر گردنیں اکڑائے بیٹھے ہیں اور بھنگڑے ڈال رہے ہیں کہ "یہاں بدعنوان افسر تو نکل گئے ہم تو بچے ایمان دار ہیں" اور اس کے ساتھ ہی ایک قہقہہ بلند ہوتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹ بورڈ جس کے متعلق آئے دن پریس میں بہت کچھ چھپتا رہا ہے اس میں میاں احمد اقبال ڈائریکٹر اتنے بدعنوان نہیں تھے۔ جتنا کہ مسٹر ایس ایم حسنین، مسٹر ایس ایم حسنین میاں احمد اقبال کے دستِ راست اور مشیر بھی تھے اور فضلِ ربی کا بہت بڑا حصہ اس رعایت سے مسٹر حسنین کی جیب میں ہی جاتا تھا۔ لیکن آڑے وقت میں مسٹر حسنین نے میاں اقبال کو اکیلا چھوڑ دیا اور تمام بدنامی کا ذمہ دار میاں صاحب کو ٹھہرا دیا۔ میاں اقبال صاحب کا سب سے بڑا یہ قصور بھی تھا کہ انہوں نے مسٹر حسنین کو اپنی ڈھال سمجھا اور تمام دفتری ذمہ داری ان کے سپرد کر دی اور جو کچھ ہوتا رہا اس کی طرف سے بالکل آنکھیں موندلیں اور بے جزو فرد کے صوفہ میں پڑے ہوتے رہے۔ ہم اس بات پر حیران ہیں کہ اگر میاں اقبال صاحب کو بدعنوان قرار دیا جاتا ہے تو مسٹر حسنین جو جی۔ ایچ۔ کیو میں سب سے زیادہ اس معاملہ میں نام ہیں وہ کیسے ایک ایمان دار افسر ہو سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میاں صاحب ان داؤ پیچوں سے واقف نہیں تھے جن میں مسٹر حسنین صاحب ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

بدعنوان قسم کے حضرات میں ایک صفت اور بھی ہوتی ہے کہ ان کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ جب وہ کسی احتساب کو نازل ہوتا دیکھتے ہیں تو قبل از وقت حفاظتی اقدامات کر لیتے ہیں۔ ان کی گاڑیاں حرکت میں آجاتی ہیں۔ شراب و کباب اور رشوت سفارش و خوشامد کے ہتھیاروں کے استعمال کے علاوہ یہ لوگ اُس جنس کو بھی استعمال کرتے ہیں جس نے یحیٰ جیسے انسان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا اور نتیجتاً وہی ڈھاک کے تین پات اصل مجرم بچ نکلتا ہے۔ اور غالباً میاں اقبال صاحب اس میں پیچھے رہ گئے۔ اس بورڈ سے بدعنوانی اُس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی۔ جب تک مسٹر حسنین سیٹ پر موجود ہیں۔

یہاں ہم ایک اور ہستی کی طرف اشارہ کر دیں اور وہ ہے احمد حسنین۔ یہ صاحب حسنین صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں بہت کایاں شخص ہے۔ بظاہر ایس ڈی او ہے لیکن اندرونی طور پر ان کے کارنامے بہت عظیم ہیں۔ یہ صاحب چھوٹے ملازمین میں راہ و رسم بڑھائے رکھتے ہیں اور اس طرح مفاد حاصل کرنے کے علاوہ اپنے بھائی کے لئے جاسوسی کا کام بھی سرانجام دیتے ہیں۔ جو کلرک یا چپڑاسی ان کو خوش رکھے وہ بہت ہی فائدہ میں رہتا ہے۔ نہ اس کی حاضری ہوتی ہے اور نہ ہی اس کو کوئی فکر ہوتا ہے۔ بس مہینہ کے مہینہ آ جاتے اور تنخواہ مفت میں لے جاتے۔ جس پر یہ صاحب ناراض ہو جائیں بس اس کی شامت آجاتی ہے۔ ان ہی صاحب کی معرفت بڑے بڑے کام کروائے جاتے ہیں۔ اور حد یہ ہے کہ آج تک ان صاحب نے دفتر میں کوئی کام نہیں کیا اور نہ ہی ان کا کبھی تبادلہ ہوا۔ ہمارے خیال میں جہاں ایس ایم حسنین صاحب ڈیپارٹمنٹ کی بدنامی کا باعث بنے ہوتے ہیں۔ مسٹر احمد حسنین کچھ کم قصوروار نہیں۔ چھوٹے ملازمین میں افراتفری اور ہراس پھیلانا۔ دوسرے افسروں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا ان کا اولین فرض ہے اور جن کے خلاف احمد حسنین صاحب پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایمان دار ہوتے ہیں بلکہ وہ اس محکمہ میں کچھ تبدیلیوں کے خواہاں بھی ہوتے ہیں۔ اور یہی خدشہ ہے کہ نئے ڈائریکٹر کو یہ دونوں بھائی کام نہیں کرنے دیں گے۔ میں ایک محب وطن کی حیثیت سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹس کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایس ایم حسنین کے خلاف تحقیقات کی جائیں کہ وہ کیوں احتساب سے بچ گئے اور احمد حسنین صاحب (حسنین صاحب کے چھوٹے بھائی) کا کسی ایسے علاقہ میں تبادلہ کیا جائے جہاں کوئی ایمان دار اور سخت افسر متعین ہو۔ حکومت کا فرض ہے کہ بدعنوانی کو "واقعتاً" ختم کیا جائے اور افسروں کو کھلی چھٹی نہ دی جائے۔ اُن سے وہ تمام غیر ضروری اختیارات چھین لئے جائیں۔ جن کی بدولت وہ خدا بن جاتے ہیں۔ ایسی تدابیر کی جائیں کہ افسر یا سرکاری ملازم عوامی احتساب کے آگے بے بس ہو جائے اور اس کو عوام کے سامنے سر جھکانا پڑے۔

نئے عزم کے ساتھ
قومی تعمیرِ نو کے لئے
رواں دواں

پاکستان میں صفِ اوّل کا جہاز راں ادارہ 'نیشنل شپنگ کارپوریشن'
ملکی معیشت کی تنظیمِ نو کے مقدس فریضہ میں اپنا بھرپور کردار ادا
کرنے کے لئے ایک بار پھر کمربستہ ہے تاکہ وقت کے نئے تقاضوں کا
چیلنج قبول کرتے ہوئے ایک بہتر، زیادہ مضبوط اور
خوشحال پاکستان کی تعمیرِ نو ہو سکے۔



نیشنل شپنگ کارپوریشن
پاکستان کا عظیم جہاز راں ادارہ

. united NSC 7/72

بنگالی عوام مجیب سے مایوس ہو گئے



‘پاکستان کی جیل
بنگلہ دیش سے زیادہ آرام دہ تھی’

نعیم الحسن

نذرل اور ٹیگور کا بنگال ... ؟
سراج الدولہ اور شہید تیتو میر کا بنگال ... ؟
پدما اور بوڑھی گنگا کا دیش ... ؟
بارش، طوفان اور دھان کے سنہرے خوشوں کا بنگال ؟

سنہرا مشرقی پاکستان، بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب ہولناک تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ سات کروڑ زندہ اور جاگتے ہوئے انسانوں کا پوربو پاکستان جہنم بن چکا ہے۔ انسان، انسان کو کاٹ رہا ہے۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے انتشار، نراجیت اور لاقانونیت کا دَور دورہ ہے مغربی پاکستان سے علیحدگی کے بعد امن و امان خوشحالی اور استحصال سے نجات کا خواب دھواں دھواں ہو چکا ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ سوچ رہا ہے رہا ہے کہ اتنی ساری قربانیوں کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن، مکتی باہنی اور بھارت روس کے گٹھ جوڑ نے انہیں کیا دیا۔ "نیوز ویک" کے مبصر نے لکھا ہے کہ اندرونی خلفشار، نراجیت اور لوٹ مار کا سلسلہ بنگلہ دیش کو تباہ کر دے گا۔ خانہ جنگی اور پاک بھارت جنگ کے سبب "بنگلہ دیش" کی معیشت تباہ ہو چکی ہے سرسبز و شاداب کھیت بنجر اور ویران ہو گئے ہیں۔ سرکاری خزانہ خالی ہے لاکھوں افراد قتل کیے جا چکے ہیں اور قتل و غارت گری کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

مشرقی پاکستان کے حالیہ بحران کے دوران بنگالی عوام میں شیخ مجیب الرحمٰن ایک "قومی ہیرو" کی شکل میں نمودار ہوئے تھے۔ سیاسی مبصروں کا خیال تھا کہ "مغربی پاکستان سے رہائی" کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن نام نہاد بنگلہ دیش کی ابتر صورتِ حال پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ طوفانوں اور جنگوں کا مارا ہوا مشرقی پاکستان ایک بار پھر آزاد، خود مختار اور خوشحال ملک کی حیثیت سے نمودار ہو گا۔ مگر نام نہاد بنگلہ دیش کے موجودہ حالات نے سیاسی مبصروں کی اس رائے پر پانی پھیر دیا۔ بنگلہ دیش کی سیاسی اور اقتصادی بے چینی دُور کرنے اور ابتر حالات پر قابو پانے میں شیخ مجیب الرحمٰن سراسر ناکام ہو گئے۔ بظاہر وہ بنگلہ دیش کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ مگر ان کی حیثیت اتنی غیر مؤثر ہے کہ ان کی بار بار اپیل پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ ان کی حکم عدولی کی جاتی ہے۔ اور انہیں سرِعام بھارت کے ادنیٰ ایجنٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

کلکتہ کے مارواڑی بنئے اور سوویت یونین اس ناگفتہ بہ حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے میں مصروف ہیں۔ امداد کے بہانے وہاں کی کلیدی معیشت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ لٹے پٹے اور زخم خوردہ عوام سے کسی کو ہمدردی نہیں ہے۔ اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی امدادی اداروں کے نمائندوں کا کہنا ہے کہ "بنگلہ دیش" کی انتظامیہ امدادی کاموں پر بھرپور توجہ نہیں دے رہی ہے۔ امدادی فنڈ کے استعمال میں ہر روز تاخیر سے کام لیا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں عوام کے مصائب اور مشکلات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔" ان کا کہنا ہے کہ بنگلہ دیش میں ایک تباہ کن قحط کا خطرہ منڈلا رہا ہے صنعتیں بے کار ہیں۔ مشینیں بے کار ہو چکی ہیں۔ خام مال موجود نہیں۔ مغربی پاکستان کے مالکان کی چار سو فیکٹریاں بند پڑی ہیں۔ انہیں چلانے کے لیے بنگلہ دیش میں ہنر مند افراد موجود نہیں ہیں۔ پورے ملک کا مواصلاتی نظام اور آمد و رفت کے راستے مکمل طور پر تباہ ہو چکے ہیں۔ جنگ کے دوران تقریباً پانچ سو سڑکیں اور ریلوے پُل دھماکے سے اڑا دیئے گئے۔ رسد کی سپلائی کے لیے مشکل سے ایک آدھ سڑک صحیح حالت میں ملے گی۔

بنگلہ دیش کی انتظامیہ بدانتظامی کا شکار ہے بیرونی ملکوں کی امداد کو غلط اور فضول کاموں میں خرچ کر دیا جاتا ہے۔ چھ کروڑ ڈالر کی امداد سے دو بڑے پلوں کی تعمیر کی جا سکتی ہے مگر اس رقم کو کمبلوں پر خرچ کر دیا گیا۔ اسی طرح دو کروڑ ڈالر ہینڈ پمپوں کی خریداری کی بجائے ادویات منگوانے پر خرچ کر دیا گیا جب کہ عوام ہیضہ کے مرض سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔

بھارت سے مہاجرین کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ اس مسئلے کا سب سے خطرناک اور سنگین پہلو یہ ہے کہ مشرقی پاکستانیوں کے علاوہ کلکتہ اور بھارت کی دوسری جگہوں سے غول کے غول بھارتی باشندے ڈھاکہ، رنگ پور، پاربتی پور، کشتیا اور چاٹگانگ پہنچ رہے ہیں۔ بنگلہ دیش کی انتظامیہ دلی حکومت کی اس قدر زیر بار ہے کہ سر اٹھا کر اس کے خلاف احتجاج بھی نہیں کر سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کی آبادی بے قابو ہو کر تیزی سے پھیل رہی ہے ڈھاکہ میں گزشتہ ہفتے ایک لاکھ ۷۵ ہزار بے روزگار افراد پہنچے ہیں یہ صرف ایک ہفتہ کے اعداد و شمار ہیں۔ لوگ فٹ پاتھوں، سڑکوں، تباہ شدہ مکانوں اور ریلوے لائنوں کے کنارے سوتے ہیں۔ جون کے مہینے سے مون سون کا موسم شروع ہو گا طوفان اور سیلاب کا خطرہ ایک بار پھر ننگے بھوکے اور پریشان حال بنگالی عوام کو دبوچنے کے لیے دم بدم آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد بھوک بیماری اور بے روزگاری میں ناقابلِ بیان اضافہ ہو گا۔ شیخ مجیب الرحمٰن اس طرف دھیان دینے اور عوام کے مسائل ٹھوس بنیادوں پر دُور کرنے کی بجائے اندرا گاندھی اور کوسیجن کو محض خوش کرنے کے لیے شکریہ کے نئے نئے الفاظ تلاش کر رہے ہیں "بنگلہ دیش" میں اقوام متحدہ کے امدادی کاموں کے نگران مسٹر ٹونی ہیگن نے واضح طور پر اعلان کر دیا ہے کہ آئندہ چند ہفتوں میں خوراک کے حصول کے لیے فسادات کا زبردست خطرہ ہے۔"

تشدّد کے واقعات

مجیب الرحمٰن اندرا گاندھی اور کوسیجن کے نام نہاد "بنگلہ دیش" میں چوری، ڈکیتی، قتل اور تشدد کے واقعات

"بنگلہ دیش" پاگلوں اور جنونیوں کا ملک بن گیا ہے

میں ہر روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اگر کوئی بڑا فساد شروع ہو گیا تو "بنگلہ دیش" کے وجود کے خاتمے میں چند ہفتوں سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ بڑے بڑے شہروں میں لڑائی جھگڑے روزمرّہ کے معمول بن گئے ہیں۔ لوٹ مار ایک عام چیز بن گئی ہے۔ ڈھاکہ کے ایک امیر شخص کو سات بار لوٹا گیا۔ آخری بار جب وہ شکایت لے کر پولیس اسٹیشن پر پہنچا تو اس کے جسم پر صرف ایک جانگیہ تھا۔ لاکھوں بہاریوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔ عوامی لیگ اور بھارتی حکومت نے جس انداز میں بنگلہ دیش کی تحریک کو ہوا دی ہے اس کی وجہ سے عام بنگالی بہاریوں یا غیر بنگالیوں سے نفرت کرنے لگے اور انہیں مغربی پاکستان کے ساجھے دار کی حیثیت سے تشدد اور مظالم کا نشانہ بناتے ہیں۔ بنگالیوں کا کہنا ہے کہ —— "مارچ میں جب یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان میں وسیع پیمانے پر فوجی کارروائی کا فیصلہ کیا تو مشرقی پاکستان میں مقیم غیر بنگالیوں نے بنگالیوں کا ساتھ دینے کی بجائے مغربی پاکستان کے حکمرانوں اور فوجیوں کے ساتھ مل کر لاکھوں بنگالیوں کے قتلِ عام میں حصہ لیا۔"

نام نہاد آزادی کے بعد مکتی باہنی کے ہزاروں رضاکار کھلنا میں بہاریوں کے کیمپ پر حملہ آور ہوئے اور سینکڑوں افراد کو قتل کر دیا۔ لاقانونیت کی ایک بڑی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مکتی باہنی کے ہزاروں رضاکاروں نے ابھی تک اسلحہ واپس نہیں کیا۔ ان رضاکاروں کی قیادت نام نہاد جنرل عبدالقادر صدیقی کر رہا ہے۔ جس نے سرِ عام ہزاروں غیر بنگالیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے پاس اس قسم کی بربریت کی روک تھام کے لیے کوئی مؤثر ہتھیار نہیں ہے۔ شخصی حکومت ان حالات پر قابو پانے میں بے بس اور مجبور نظر آتی ہے۔ شیخ مجیب کے گھر پر دن رات درخواست گزاروں اور ضرورتمندوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ طلباء نصاب کی کتابوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ سرکاری ملازمین کاغذات پر دستخط کرانے کے لیے کھڑے رہتے ہیں۔ بے روزگار روزگار کی فراہمی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ نام نہاد بنگلہ دیش کے وزیرِ اعظم کے لیے ہر شخص کو مطمئن کرنا یا انکار کرنا مشکل بن گیا ہے۔ ان کے بیشتر احکامات کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ عوام کے مسائل سلجھنے کی بجائے الجھتے جا رہے ہیں۔ بنگالی عوام ان سے مایوس ہو چکے ہیں۔ بے چینی بڑھ رہی ہے تلخی جنم لے رہی ہے مجیب کا بنگلہ دیش آنے والے طوفان کی لپیٹ میں ہے۔ ڈھاکہ کے ایک سفارتی افسر کا کہنا ہے کہ ایسی صورت حال میں کاروبارِ مملکت کس طرح چلایا جا سکتا ہے یہ پاگلوں اور جنونیوں کا ملک بن گیا ہے۔"

مجیب الرحمٰن کا حال بہت خراب ہے۔ ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پھیلے ہوئے ہیں۔ پیشانی کی شکنوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں گہری سوچ اور مایوسی بڑھ گئی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ "میرے سینے اور بائیں بازو میں شدید درد ہے مگر میں آرام بھی نہیں کر سکتا۔ میرے گھر کے دروازے پر ہر وقت بے پناہ ہجوم لگا رہتا ہے اور جب یہ لوگ چلے جاتے ہیں تو دوسرا ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ آرام تو مجھے پاکستان کی جیل میں ملا!"

بھارت "بنگلہ دیش" کی مفلوج معیشت اور سنگین صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں مصروف ہے۔ اندرا گاندھی عوام کے مسائل حل کرنے کے پروگرام میں اعانت کرنے کی بجائے موجودہ حالات کو زیادہ سے زیادہ خراب دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس طرح ان حالات سے فائدہ اٹھا کر وہ "بنگلہ دیش" کو مکمل طور پر ایک نوآبادی کی حیثیت دینا چاہتی ہیں۔ پچھلے دنوں جب وہ "بنگلہ دیش" آئی تھیں تو اس دوران جوٹ کی بھاری مقدار بھارت اسمگل کر دی گئی اس طرح وہ اور ان کے ہندو بنیے مشرقی پاکستان کے عوام کو زرِ مبادلہ سے محروم کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں جنگ کے دوران بھارت کو جتنے ہتھیار، اسلحہ اور جنگی سامان ہاتھ لگا وہ بھارت منتقل کر دیا گیا۔ "بنگلہ دیش" کے ایک عہدیدار نے کہا کہ جنگ کے بعد ہمارے یہاں سے بھارت جو کچھ لے گیا اس پر ہمارا حق تھا۔"

ماسکو تیزی سے بنگلہ دیش پر اپنا اثر بڑھا رہا ہے۔ ڈھاکہ کے سینماگھروں اور جنگ سے متاثرہ پارکوں اور سڑکوں پر روس کی پراپیگنڈہ فلمیں دکھائی جا رہی ہیں۔ روس "بنگلہ دیش" کو اقتصادی اور مالی امداد بھی دے رہا ہے۔ مگر وہ نیک نیتی سے امداد نہیں دے رہا ہے۔ وہ "بنگلہ دیش" کے محلِ وقوع اور خام مال سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ "بنگلہ دیش" کو اپنی مصنوعات کے لیے تجارتی منڈی بنانا چاہتا ہے اور بنگالی عوام کی دولت کو اپنی جھولی میں سمیٹنا چاہتا ہے۔ اسے اس بات کا خوف بھی لاحق ہے کہ کہیں بنگلہ دیش میں چین کا اثر و رسوخ نہ بڑھ جائے۔ وہ نام نہاد بنگلہ دیش میں اپنی پٹھو حکومت لانا چاہتا ہے تاکہ چینی کمیونسٹوں کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم کر سکے۔ وہ بنگلہ دیش کو امریکہ کے اثر سے بھی باہر رکھنا چاہتا ہے جبکہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی کابینہ کے بیشتر امریکہ نواز وزیر امریکی امداد کی آس لگائے ہوئے ہیں ان کا خیال ہے کہ جس روز امریکہ نے امداد دینے کا فیصلہ کر لیا اس روز ان کے مسائل ختم ہو جائیں گے۔

ادھر بھارت بنگلہ دیش میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے شیخ مجیب کو زیادہ دیر تک استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح بھارت اور روس کی اقتصادی اور مالی امداد ایک ایسا سیاسی جال ہے جس میں بنگالی عوام کو تیزی سے الجھایا جا رہا ہے۔ یہ صورتِ حال جتنی دیر قائم رہے گی بھارت، روس اور شیخ مجیب الرحمٰن کے حق میں خطرناک ثابت ہو گی کیونکہ عوام کے مسائل حل نہ ہوں گے۔ بے چینی اور بے اطمینانی بڑھے گی۔ شیخ مجیب سے مایوس ہونے کے بعد بنگالی عوام طبقاتی بنیادوں پر سوچنا شروع کر دیں گے۔ روس بھارت اور شیخ مجیب الرحمٰن کی پٹھو حکومت سے نفرت بڑھے گی اور بالآخر وہاں کے مزدور اور کسان اس تثلیث کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے حقیقی معنوں میں ایک عوامی جمہوریت قائم کریں گے جو آگے چل کر ایک پائیدار سوشلسٹ نظام میں ڈھل جائے گی

بقیہ: محمود ہارون سے ایک ملاقات

طور پر صنعت کاروں کو اپنے مستقبل کا یقین ہو۔ انہوں نے صدر بھٹو کے اس بیان کو ناکافی قرار دیا کہ مزید صنعتوں کو قومی ملکیت میں نہیں لیا جائے گا۔ محمود ہارون نے کہا کہ ملک کے صنعت کاروں کو اس بات کا یقین دلانا چاہیئے کہ کتنے عرصے تک صنعتیں قومی ملکیت میں نہیں لی جائیں گی۔ کیونکہ کوئی بھی صنعت لگائی جائے جس کا منافع دو چار سال کے بعد ملنے کی توقع ہو لیکن دو سال بعد اس صنعت کو قومی ملکیت میں لیے جانے کا خطرہ ہو تو صنعت کار یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔

جناب محمود ہارون نے کہا ہے کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ملک کی تباہی ہر شخص کو نظر آ رہی ہے اور یہ بات اچھی طرح واضح تھی کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا چاہتا ہے لیکن سرمایہ دار نے ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری ترک نہ کی۔ سیاستدان اقتدار کا رونا روتا رہا اور سرکاری افسر بدعنوانیوں کے مرتکب ہوتے رہے۔ کسی شخص میں اتنی اخلاقی جرأت نہ ہوئی کہ میدان میں نکلتا اور عملی طور پر قوم کو تباہی سے بچانے کے لیے قدم اٹھاتا۔

بدعنوانیاں

یہ مضمون بدعنوان اور نااہل قرار دئے جانے والوں کی فہرس منظرِ عام پر آنے سے پہلے لکھا گیا تھا۔ اسے روکنے کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ لیکن مودودیئے اور نام نہاد اسلام پسند ان کو اب بھی معصوم قرار دے رہے ہیں۔ ان حالات میں یہ مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ تفصیلات بعد میں شائع ہوں گی ——— (ادارہ)

جامعہ کراچی کی "پھڈا اینڈ کمپنی"

ٹرانسپورٹ پر پانچ لاکھ روپے سالانہ کا نقصان

الفتح رپورٹ

جامعہ کراچی کو شعبۂ ٹرانسپورٹ پر پانچ لاکھ روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اس خسارے پر قابو پانے کے لئے پچھلے مہینے شیخ الجامعہ ڈاکٹر محمود حسین نے ایک کمیٹی مقرر کی۔ ذمہ داری اس کے سپرد یہ کی گئی کہ ٹرانسپورٹ کا نظام بہتر بنایا جائے۔ بدعنوانیوں کی روک تھام کی جائے۔ ان کی نشان دہی کی جائے۔ طلباء کے اس دیرینہ مسئلہ کو مؤثر طور پر حل کیا جائے۔

یہ تحقیقاتی کمیٹی اپنی ذمہ داری میں کس حد تک کامیاب ہوگی۔ اس کے بارے میں فی الحال کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا قرائن بتاتے ہیں کہ کسی فرد واحد کو تمام بدعنوانیوں کا ذمہ دار ٹھہرانا ممکن نہیں۔ بعض حلقے جامعہ کو موجودہ نظام کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ جامعہ کے خازن جو ٹرانسپورٹ کے بھی انچارج ہیں تمام بدعنوانیوں کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ جامعہ کراچی کی تمام بدعنوانیوں اور خانہ خرابیوں کا سہرا رجسٹرار نجم الدین کے سر ہے۔ ٹرانسپورٹ کے تمام گھپلوں سے انہیں کسی طور بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جامعہ سے قریبی تعلق رکھنے والے حلقوں کے مطابق جامعہ کراچی میں دس سال قبل صرف دو بڑی بسیں اور دو مائکرو بسیں تھیں۔ آج ان کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہے۔ ۱۹۶۸ء تک شعبہ ٹرانسپورٹ کے انچارج رجسٹرار تھے ان کی ماتحتی میں اسسٹنٹ رجسٹرار، ایک اسسٹنٹ مکینک اور موجودہ عملہ تھا۔ لیکن ٹرانسپورٹ کا بندوبست سخت ناکارہ تھا۔ چنانچہ طلباء میں بے چینی پھیلی جس نے رفتہ رفتہ سنگین صورت اختیار کر لی۔ اساتذہ بھی قطعی غیر مطمئن تھے۔ جب ہر طرف سے لتاڑ پڑی اور رجسٹرار کی بدعنوانیوں کا شہرہ عام ہوا تو سابق شیخ الجامعہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بادلِ نخواستہ رجسٹرار کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کیا۔ ان کی جگہ جامعہ کے آڈیٹر مسٹر اختر کو مقرر کیا۔ لیکن ٹرانسپورٹ کے عملے میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کارروائی جان بوجھ کر کی گئی۔ تاکہ ٹرانسپورٹ کا نظام سنبھلنے کے بجائے آگے چل کر ٹھپ ہو جائے۔ آڈیٹر کو نیک نامی کے بجائے بدنامی ملے۔ یوں بھی یہ اقدام دانش مندانہ نہ تھا حق بجانب نہ تھا۔ آڈیٹر کا کام حساب کتاب کی جانچ پڑتال ہے ٹرانسپورٹ چلانا نہیں۔ نہ ان کو پہلے سے اس کا کوئی تجربہ تھا۔ مگر اس وقت وہ صحت مند آدمی تھے بھاگ دوڑ کی۔ جانفشانی سے کام لیا۔ دفتری اوقات کے علاوہ بھی وقت صرف کیا اس طرح ٹرانسپورٹ کا کام کسی حد تک سنبھل گیا۔

جب شعبہ ٹرانسپورٹ کسی قدر اطمینان بخش ہوگیا تو آڈیٹر کو خازن بنادیا گیا۔ ساتھ ہی ٹرانسپورٹ کا انتظام بھی۔ حسب معمول ان کے ذمے رہا۔ اس دوہری ذمہ داری اور کام کی زیادتی نے انہیں بسترِ علالت پر لٹا دیا۔ وہ عارضہ قلب میں مبتلا ہوگئے۔ اس وقت بھی بیمار ہیں۔ ان کی غیر حاضری میں ماتحت عملے نے من مانی کرنی شروع کردی ٹرانسپورٹ کچھ عرصے کے بعد ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ چھان بین ہوئی تو یہ عقدہ کھلا کہ اس کی ذمہ داری ٹرانسپورٹ سپروائزر پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا یکم جنوری ۱۹۷۲ء کو سپروائزر کو ملازمت سے برطرفی کا نوٹس دے دیا گیا۔ لیکن سپروائزر رجسٹرار کے مقرب خاص ہیں۔ رجسٹرار اور ان کے اہل و عیال کی ضروریات اور تفریح کے لئے گاڑیاں فراہم کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ صاف بچ گئے۔ نوٹس داخل دفتر ہوا۔ ملازمت بحال رہی بلکہ تنخواہ اور الاؤنس میں کچھ ترقی بھی ہوئی۔ اب سپروائزر اس مشکل کشائی کا صلہ رجسٹرار کو ادا کرتے ہیں۔ رجسٹرار کی دو صاحبزادیاں روزانہ تین بجے سہ پہر کو جانے والی مائکرو بس کے عملے کے ساتھ ٹیوشن پڑھانے ہاؤسنگ سوسائٹی جاتی ہیں۔ جب تک وہ اپنے ٹیوشن میں مصروف رہتی ہیں مائکرو بس ان کا انتظار کرتی ہے۔ یہ انتظار عام طور پر دو گھنٹے سے کسی طور کم نہیں ہوتا۔ لطف یہ کہ اس مائکرو بس سے جتنے افراد جامعہ سے شہر جاتے ہیں پابندی سے ۴۰ روپے ماہوار کرایہ ادا کرتے ہیں۔ رجسٹرار کی صاحبزادیاں گرہ سے کچھ نہیں خرچ کرتیں۔ پابندی سے جاتی ہیں، پابندی سے واپس آتی ہیں اور پابندی سے بس کو انتظار میں کھڑا رکھتی ہیں۔ یہ سلسلہ سالہا سال سے چل رہا ہے۔

ٹرانسپورٹ کمیٹی جس کے سپرد اس وقت ٹرانسپورٹ کا انتظام ہے۔ وہ تین اساتذہ، ایک افسر اور ایک طالبعلم پر مشتمل ہے۔ اس طرح اساتذہ کی کارگزاری اور طالب علم کی پڑھائی بری طرح متاثر ہورہی ہے۔ اساتذہ کا کام پڑھانا اور طالب علم کا کام پڑھنا ہے، ٹرانسپورٹ چلانا نہیں۔ یہ بھی جامعہ کراچی کی انفرادیت ہے کہنے والے اسے بدنظمی اور نااہلی کہتے ہیں۔ اس بدنظمی اور نااہلی کا سلسلہ جامعہ کے شعبے میں مکڑی کے جال کی طرح پھیلا ہے۔ جو شخص جس ذمہ داری پر مامور ہے۔ وہ اس فن سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا۔ مثلاً ڈاکٹر انور، خورد حیاتیات میں ڈاکٹر نہیں مگر صدر شعبۂ خورد حیاتیات ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر ضحیٰ فارمیسی کی فنی تعلیم و تربیت سے قطعی نابلد ہیں مگر شعبۂ فارمیسی کے صدر ہیں۔ یہی حال رجسٹرار کا ہے۔ اسی یونیورسٹی میں وہ سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے انتظامی امور میں نااہل قرار دیے گئے۔ مگر اشتیاق حسین قریشی کی نظروں میں سرخرو ہوئے۔ بام ترقی پر چڑھے۔ رجسٹرار بنے۔ اصول کے بجائے اس میں اقرباپروری کو دخل تھا۔ اسی اقرباپروری کے نتیجے میں ڈاکٹر ضحیٰ کو REPLACEMENT BUREAU

کا صرف اس لئے ڈائریکٹر بنایا گیا کہ ان کی تنخواہ میں ۲۵۰ روپے ماہوار کا اضافہ ہو جائے۔ یہ اقربا پروری رجسٹرار نجم الدین کے ہاتھوں ہوئی۔ ڈاکٹر صنمی ان کے ہم وطن بھی ہیں اور رشتہ دار بھی ہیں۔

شیخ الجامعہ نے جو تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی ہے۔ اس میں اسسٹنٹ رجسٹرار یوسف الدین بھی شامل ہیں۔ جنہیں ان کے عہدے سے ہٹا کر ایک نہایت معمولی کام پر معمور کیا گیا تھا یہ کارروائی اس لئے کی گئی کہ موصوف نے بعض اساتذہ سے متعلق جامعہ کے کچھ راز ان کے حریف اساتذہ تک پہنچا دیئے۔ جس پر زبردست ہنگامہ برپا ہوا سخت اشتعال پھیلا معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شعبہ کیمیا کی ایک خاتون لیکچرر نے جامعہ کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ یہ مقدمہ ہنوز عدالت کے روبرو ہے۔ لہٰذا اس کے بارے میں کہنے کی کچھ گنجائش نہیں۔

اسسٹنٹ رجسٹرار یوسف الدین کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ محض نا اہلی کے باعث تو انہیں ڈپٹی کنٹرولر بنایا گیا۔ اور نہ انسپکٹر آف کالجز کا عہدہ ان کے سپرد کیا گیا۔ ڈپٹی کنٹرولر جیسے بنایا گیا وہ عہدے اور سینیارٹی کے اعتبار سے یوسف الدین سے کئی سال جونیئر ہیں۔ مگر یہ جس قدر نا اہل بتائے جاتے ہیں وہ اسی قدر با صلاحیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ یوسف الدین وہی ہیں جو بحیثیت اسٹیورڈ کاغذ کی خریداری میں جامعہ کو دھوکہ دینے کے الزام میں ماخوذ رہ چکے ہیں۔ یہ واقعہ ۲ جنوری ۱۹۶۳ء کا ہے۔ شام کو شائع ہونے والے کراچی کے اخبار "لیڈر" میں یہ خبر اسی طرح شائع ہوئی۔

"کراچی۔ ۲ جنوری۔ پاکستان اسپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ نے کراچی یونیورسٹی کے اسٹیورڈ اور چند افسران اور تین مقامی فرموں کیخلاف دھوکہ دہی اور خرد برد کرنے کے الزام میں تین مقدمات درج کئے گئے۔ ان پر یہ الزام عاید کیا گیا کہ انہوں نے جامعہ کے واسطے مختلف اشیاء کی بوگس خریداری دکھائی اور جعلی رسیدیں پیش کر کے ۴۵ ہزار کی رقم حاصل کی اور اسے خرد برد کر دیا۔ پولیس کے مطابق اسٹیورڈ یوسف الدین اور جامعہ کے چند افسران اور میسرز محمدیہ ورکس نے ۱۰۱۰۲ روپے کی مالیت کے پیڈسٹل پنکھوں اور لوہے کی الماریوں کی جعلی خریداری کی رسیدیں پیش کر کے جامعہ سے یہ رقم حاصل کی تھی۔ یہ تمام اشیاء جامعہ کے اسٹور میں کبھی وصول نہیں ہوئیں۔

اسی طرح یوسف الدین جامعہ کے چند دوسرے افسران میسرز کامن ویلتھ ٹریڈرز اور میسرز یونائیٹڈ پیپر مارٹ نے ۴۸۱۹ روپے اور ۵۰۰۰ روپے کی مالیت کی "کریم لیڈ پیپر" کی جعلی خریداری کی اور جامعہ سے یہ رقم وصول کی۔ ایسا کوئی کاغذ جامعہ کے اسٹور میں کبھی وصول نہیں کیا گیا۔"

تحقیقاتی کمیٹی کے ایک اور رکن ڈاکٹر اعجاز نعیم ہیں ان کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ جب سے وہ بیرونی سفر سے واپس آئے ہیں درس و تدریس کے بجائے ٹیچرز سوسائٹی کے کاموں اور رجسٹرار کے دفتری اور خانگی امور میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں ان کی شہرت اور نیک نامی کا یہ عالم ہے کہ ایک طالبہ سے مبینہ طور پر چھیڑ چھاڑ کرنے کے باعث طلباء نے انکی مرمت کی۔ ان کے ہاتھوں جامعہ کی کئی معصوم طالبات کی زندگی مبینہ طور پر برباد ہوئی۔ اس سلسلے میں ایم ایس سی، سال اول کی ایک طالبہ کا قصہ جامعہ میں بہت مشہور ہے۔ اس لڑکی کا تعلق متوسط طبقے کے ایک شریف گھرانے سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس عصمت مآب لڑکی نے ڈاکٹر نعیم کی "ہوس" کا مبینہ طور پر شکار سے انکار کر دیا تو انہوں نے اسے دھمکی دی کہ وہ اس کا تعلیمی کیریئر تباہ کر دیں گے۔ ہم نے جان بوجھ کر اس لڑکی کا نام اور واقعات کی تفصیل سے گریز کیا ہے۔ مبادا یہ اظہار ایک شریف لڑکی کی رسوائی کا باعث نہ بن جائے اور بندر کی بلا طویلے کے سر جائے۔

جن کا دامن اس قدر آلودہ ہو۔ کیا ان سے حق و انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے؟ کیا وہ شعبہ ٹرانسپورٹ کی دھاندلیوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں؟ اصل حقائق کو منظر عام پر لا سکتے ہیں؟ سوال توقعات کا نہیں۔ سوال اس بات کا ہے کہ شیخ الجامعہ نے تحقیقات کے لئے ایسے افراد کو کیوں منتخب کیا جن کا کردار خود تحقیقات کا محتاج ہے۔ جن کے خلاف تحقیقاتی کمیٹی بٹھانے کی ضرورت ہے۔ کیا جامعہ کی اس "پھڈا اینڈ کمپنی" کے قیام کا کوئی جواز ہے۔؟

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔

"ڈان" پر ہارون خاندان کے غاصبانہ قبضہ کی داستان صفحہ ۱ سے آگے

اور ولی خان ہمیشہ اس اخبار کے صفحۂ اول پر جگہ پاتے رہے خواہ انہوں نے کسی چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی یہ بیان دیا ہو جب کہ کراچی میں ہونے والے بھٹو کے بڑے سے بڑے جلسے کو اندر کے صفحات میں کونے کھدرے میں جگہ ملتی تھی۔ گزشتہ سال مارچ ۱۹۷۱ء تک اس اخبار نے مجیب کی علیحدگی کی تحریک کی حمایت کی۔ محمود ہارون کا تو موجودہ بیان بھی اسی پالیسی کی ترجمانی کر رہا ہے۔ مارچ سے لے کر دسمبر ۱۹۷۱ء تک اس اخبار نے مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کے خلاف ہر قسم کا زہر اگلا اور جب دسمبر ۱۹۷۱ء میں جناب بھٹو برسر اقتدار آئے تو ڈان گروپ بدنام زمانہ بیوروکریٹ الطاف گوہر کو ایڈیٹر انچیف کے طور پر لے آئے۔ محمود ہارون اور یوسف ہارون ملک سے باہر تھے۔ ان ہی کا اخبار پر کنٹرول ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تقرری ان ہی کے حکم پر ہوئی تھی ورنہ سعید ہارون تو بےچارے نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ الطاف گوہر نے اس عرصے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ وہ بھی سب کے سامنے ہے اور پھر انہیں "شہید صحافت" قرار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مظہر علی خان، ایس آر غوری کے کالم شروع ہوئے۔ مظہر علی خان نے روس اور بھارت کی لائن پر جنگی قیدیوں کے مسئلے کو الگ مسئلے کی بجائے سیاسی مسائل سے منسلک کیا۔ یہ لائن روس اور بھارت نے بعد میں اختیار کی۔ "ڈان گروپ" کی اصل لائن کا اندازہ صدر بھٹو کے دورۂ روس سے ہوا۔ "ڈان"، "حریت"، "ایوننگ سٹار" اور "ڈان گجراتی" نے دورۂ روس کو پاکستان کی لبقاع کا ضامن قرار دیا۔ اور مشترکہ اعلامیے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے "ڈان" اس وقت ہمارے بدترین دشمنوں روس بھارت کی لائن "کنفیڈریشن" کی بالواسطہ انداز میں وکالت کر رہا ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی کی بھی لائن یہی ہے۔ انجام اس کا بالآخر اکھنڈ بھارت ہے۔ اس کا اظہار دوسرے لفظوں میں محمود ہارون نے کر دیا ہے کہ وہ موجودہ پاکستان کو پاکستان نہیں سمجھتے۔ اگر وہ اُسے پاکستان نہیں سمجھتے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کی بقاء کیوں چاہیں گے۔

یہ ہارون خاندان اور حکومت کا مسئلہ ہے کہ ہارون خاندان اس ملک کے وجود کے درپے ہیں اور حکومت ان سے کیا سلوک کرتی ہے۔ لیکن عوام کو تو اپنی امانت کی فکر ہے کہ وہ ایسے استحصالی اور ملک دشمن خاندان کو اجازت نہیں دے گی کہ وہ "قومی ٹرسٹ" کو اپنے خصوصی مفادات کا آلۂ کار بنائے۔ "قومی ٹرسٹ" کو قوم کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ قوم مطالبہ کرتی ہے کہ اس "قومی ٹرسٹ" کو ایک خاندان کی ملکیت سے واپس لے کر قوم کے حوالے کیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ پورا نہ کیا تو قوم اپنی اس امانت کو خود واپس لے کر رہے گی اور پھر وہ بابائے قوم حضرت قائداعظم کے سامنے سرخرو ہو سکے گی۔ حضرت قائداعظم اور مادر ملت کی روحیں بھی بےچین ہیں کہ یہ "قومی ٹرسٹ" قوم ہی کی جڑیں کاٹنے کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔

آپ جس طرف بھی کھڑے ہو کر دیکھیں

چیئرمین ماؤ آپ کو اپنی طرف آتے نظر آئیں گے

محمود شام

قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ گریٹ ہال روشن ہے۔ پرنس سہانوک —— کمبوڈیا کی جدوجہد آزادی کے قائد —— تقریر کرکے —— پاکستانیوں کے دلوں میں آزادی اور جدوجہد کی آگ تیز کرکے جا چکے ہیں۔ ہمارے صدر صاحب کو جواب میں تقریر کرنی چاہیئے۔ کیونکہ پرنس سہانوک نے پاکستانیوں کے موقف کو جس پرزور انداز میں پیش کیا۔ اتنا زور پاکستانی صدر کی تقریر میں تھا اور نہ وزیر اعظم چین کی تقریر میں۔

مگر بھٹو صاحب اپنی سیٹ پر ہی بیٹھے ہیں۔ سہانوک اور نکسن کے درمیان مقابلہ ہے۔ ہمارے نکسن سے تعلقات بہت "اچھے" ہیں۔ ہم سہانوک کی تقریر کا جواب دے کر اپنا کیس کیوں خراب کریں۔

اس کے بعد چین اور پاکستان کے قومی ترانے ہوتے ہیں۔ ڈنر ختم ہو جاتا ہے۔ مذاکرات پھر شروع ہو جاتے ہیں۔ آج مشترکہ اعلامیہ کو آخری شکل دی جانی ہے۔ ہمیں کہا جاتا ہے کہ جو صاحبان گریٹ ہال دیکھنا چاہیں، وہ ایک طرف جمع ہو جائیں۔ بیگم نصرت بھٹو۔ ہمارے ساتھ چلیں گی۔ وفد کے باقی غیر سرکاری رکن بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ گریٹ ہال۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست، وسعتیں، روشنیاں، بڑی بڑی تفصیلیں۔ یہ گریٹ ہال کا آڈیٹوریم ہے۔ یہاں پانچ ہزار افراد کی نشستوں کا انتظام ہے۔ ہر سیٹ پر بارہ زبانوں میں ترجمہ کے انتظامات ہیں۔ ایئر فون لگے ہوئے ہیں۔ سامنے بہت بڑی سکرین ہے۔ کتنے عظیم لوگ ہیں۔ کتنی عظیم عمارتیں ہیں۔ یہ ہم سے بعد آزاد ہوئے۔ ہماری نسبت انہوں نے غیر ملکی امداد وصول نہیں کی۔ ہم سے زیادہ مسائل تھے، زیادہ آبادی تھی، زیادہ کھانے والے تھے، مگر آج یہ کہاں جا پہنچے ہیں، اور ہم کہاں ہیں۔

آج ہم یہاں بھیک مانگنے آئے ہیں، وہ ہمیں عزت نفس کا درس دے رہے ہیں، گریٹ ہال دکھا رہے ہیں، جو ان کی اپنی مدد آپ۔ آگے بڑھنے کی لگن۔ غیر ملکی امداد سے بے نیازی کا نتیجہ ہے۔ وہ ہمیں خود اعتمادی کا درس دے رہے ہیں۔ ہم ہاتھ پھیلائے ہوئے آئے ہیں۔ مگر ہاتھ پھیلانے والوں کے لباس کی چمک دمک دیکھو اور اس خود کفیل عالمی طاقت۔ عظیم قوم کے افراد کے لباس کی سادگی دیکھو۔ میں ان کا گریٹ ہال اور روشنیاں دیکھ رہا ہوں اور ساتھ اپنی ایئر ہوسٹسوں کے معطر بدن، ہیئر اسٹائل، شوخ رنگوں والی، چمکتی ہوئی ساڑھیاں دیکھ رہا ہوں۔ ہمارے پاس میک اپ فیشن، ہیئر اسٹائل، خوب صورت چہروں اور قیمتی کپڑوں کے علاوہ کیا ہے۔ جو اپنے عظیم دوستوں چینیوں کو دکھائیں۔ ہم نے شکست ضرور کھائی ہے لیکن فیشن میں تو مار نہیں کھائی۔ ہماری ایئر ہوسٹسیں فیشن کی پیغام رسانی کرتی ہیں۔

یہ پانچ ہزار نشستوں والا آڈیٹوریم۔ وقت ہوتا تو ہمیں کوئی بیلے دکھایا جاتا، مگر وقت کم ہے۔ مختلف برآمدوں شہ دریوں سے ہوتے ہم ایک اور ہال میں جا پہنچے ہیں یہاں چینی فن کاروں کی تیار کی ہوئی بڑی بڑی سبز یاں پردوں پر نصب ہیں۔ کہیں قالینوں میں تصویریں بنائی گئی ہیں۔ کہیں پلاسٹک پر۔ یہ ایشیا بلکہ موجودہ دنیا کے عظیم قائد چیئرمین ماؤزے تنگ اور ان کے ساتھیوں کی تصویر ہے۔ اس کی بے شمار سمتیں ہیں۔ آپ جس طرف بھی کھڑے ہو کر دیکھیں چیئرمین ماؤ آپ کو اپنی طرف آتے نظر آئیں گے۔ یہ فن کا کمال ہے۔ خلوص کی بلندی ہے۔ یہ کئی فٹ چوڑے اور کئی فٹ بلند پردے پر جو گاؤں نظر آ رہا ہے، اس میں چیئرمین ماؤزے تنگ کا گھر ہے۔ اتنی بڑی عظیم شخصیت کا اتنا معمولی سا گھر۔ یہ ۸۰ کروڑ کی عظیم قوم کے بانی کی پیدائش گاہ ہے۔ یہ ایک اور قد آدم پینٹنگ ہے۔ اس پر چینی میں کوئی جملہ لکھا ہے۔ اردو کی مترجم خاتون مجھے بتا رہی ہیں کہ یہ چیئرمین ماؤ کا قول ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔

"ایک چنگاری پورے جنگل میں آگ لگا سکتی ہے۔"

گریٹ ہال —— ایک عظیم قوم کا عظیم ہال —— جو چینیوں کی خود اعتمادی، خود کفالت اور جمالیات کا مرقع ہے۔ یہ ستون، بالکونیاں، چھتیں، سیڑھیاں، قالین۔ نفاست کا احساس دیتے ہیں۔ ہم گریٹ ہال دیکھ کر باہر نکل رہے ہیں آج پیکنگ میں دوسری رات ہے۔ آخری رات۔ پھر خبر نہیں ہم کب آئیں۔ سردی کی شدت وہی ہے۔ خنک ہوا گلے سے لپٹ رہی ہے۔ پیکنگ ہوٹل گرم ہے۔ خبریں بھیجنے والے خبریں بھیجنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

پیکنگ میں آخری رات گزر گئی ہے۔ ہمیں صبح صبح بتایا گیا ہے کہ اپنا سامان پیک کرکے برآمدے میں رکھ دیں۔ وہ ایئر پورٹ پہنچ جائے گا۔ ہمیں آج پرنس سہانوک سے ملنے جانا ہے، اس لئے میں اور اصحاب نقوی اس کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ دس بجے کے قریب ایک چینی مترجم نے ہمیں آ کر خالص پروٹوکولی انداز میں بتایا ہے کہ آپ کو "کمبوڈیا کے سربراہ مملکت سے ملنے جانا ہے۔" تیار رہیئے۔ گاڑی آنے والی ہے۔ ہم پرنس سہانوک سے ملتے ہیں اور ان کا انٹرویو لیتے ہیں (اس کی تفصیل "الفتح" کے ایک گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکی ہے) اس کے بعد ہم سیدھے گریٹ ہال پہنچتے ہیں۔ جہاں صدر بھٹو کی طرف سے وزیر اعظم مسٹر چو این لائی کے اعزاز میں ظہرانہ دیا گیا ہے۔ آج نسبتاً کم مہمان ہیں۔ یہ لنچ اس ہال میں ہو رہا ہے، جہاں پہلی شام کو صدر بھٹو اور وزیر اعظم چو این لائی کے کھلے مذاکرات ہوئے تھے۔ آج بھی کھانے کے اتنے ہی دور ہوں گے۔ یہ صدر پاکستان کا لنچ ہے، مگر کھانے چینی ہی ہیں۔ صرف اتنا سا فرق ہے کہ چھوٹی چھوٹی چپاتیاں بھی ہیں۔ کھانے کا دور چل رہا ہے۔ تقریریں شروع ہونے والی ہیں۔

(آخری قسط آئندہ ہفتے)

سرکاری رقم کا حشر

جب سے ٹلہار کمیٹی کا جمہوری رشتہ ختم کر کے انتظام نوکر شاہی کے سپرد کیا گیا ہے، ٹاؤن کمیٹی کا دو طرفہ نقصان ہو رہا ہے۔ ایک طرف تو شہر کی صفائی بالکل ختم ہو گئی۔ گلیوں میں گندگی اور کیچڑ کے ڈھیر جا بجا نظر آتے ہیں۔ گندے پانی کی نکاسی کا انتظام بھی بگڑ چکا ہے۔ پرانے اور تجربہ کار ملازمین کو نکال دیا گیا اور ان کی جگہ نئے اور ناتجربہ کار افراد کو رکھ لیا گیا ہے اور یہ نئے ملازمین صفائی کا انتظام سنبھالنے سے قاصر ہیں۔ صفائی نہ ہونے کی وجہ سے مکھیوں اور مچھروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے لوگوں کو بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کی کثیر رقم نیشنل بنک سے نکال کر یونائیٹڈ بنک میں فکسڈ ڈیپازٹ کرا دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ ایف ڈی اور بی ڈی کی ہدایت کے مطابق روپیہ صرف نیشنل بنک میں رکھا جانا چاہیئے۔

بدین کے کالج کے لیے دس ہزار اور سعید پور کے کالج کے لیے پانچ ہزار روپے بطور عطیہ منظور کیے گئے جب کہ ٹلہار میں لڑکیوں کا پرائمری سکول کرایہ کے مکان میں چل رہا ہے۔ اس سکول کے لیے سائنس ہال کی بھی ضرورت ہے۔ سندھی پرائمری سکول میں نہ تو بیت الخلا اور نہ ہی پانی کا انتظام ہے جس سے طالب علموں کو بڑی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے اساتذہ کو کچھ کلاسیں سکول کے برآمدے میں پڑھانی پڑتی ہیں۔ یہاں نہ تو کوئی پارک ہے اور نہ ہی کوئی لائبریری ہے۔

یہ ہماری بہت بڑی حق تلفی ہے کہ پندرہ ہزار روپے کی کثیر رقم بدین اور ٹنڈو باگو کے کالجوں کو بغیر کسی منظوری کے دے دی۔ بی ڈی کے سیکریٹری کی واضح ہدایت ہے کہ ٹاؤن کمیٹیاں تعلیم کے لیے خرچہ کرنے کی مجاز نہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ پھر بھی اتنی کثیر رقم خرچ کی جا رہی ہے اور وہ بھی شہر سے باہر۔ اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح طور پر آ جاتی ہے کہ یہ روپیہ جو شہر پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ دراصل مزدوروں، کسانوں بیوپاریوں کا ہے۔ لیکن یہ ہماری ستم ظریفی ہے۔ کہ یہ روپیہ صرف شہر والوں پر ہی خرچ کیا جا رہا ہے اور اس پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ان لوگوں کے اپنے ہی قانون ہیں اور اپنے ہی قاعدے اور ہم غریب ان کے ستم کا شکار ہو رہے ہیں۔

بقیہ: چلتے چلتے

صوبائی اسمبلی کا اجلاس ہونا ہے۔ یہ مسائل وہاں طے ہو جاتے جلوس نکال کر انہوں نے اس مسئلے کو ہوا دینے کی کوشش کی۔ طبقاتی جنگ کو لسانی جنون میں تبدیل کرنے کی کوششوں میں لگ گئے۔ یہ بھی اپنی زمینداریوں کو محفوظ رکھنے کا اچھا طریقہ ہے۔

گورنر سندھ، ہر جلوس سے خطاب کیوں نہیں کرتے؟

سندھی زبان کے لئے گزشتہ دنوں جو جلوس نکالا گیا وہ ان دنوں پہلا جلوس تھا۔ جسے خطاب کرنے کے لئے گورنر سندھ بذات خود باہر نکل آئے اور انہوں نے کسی وفد کو اندر بلانے کی زحمت نہیں کی۔ یہ خوف تھا، یا سندھی زبان سے محبت۔ اور جتنے جلوس آتے ہیں، ان سے کبھی گورنر خود خطاب نہیں کرتے، بلکہ کسی وفد کو اندر بلا لیتے ہیں اس امتیازی سلوک سے گورنر صاحب کیا ظاہر کرنا چاہتے تھے؟ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔

محمود الحق عثمانی اور روسی سفارتی عملے کی ملاقاتیں

ایک ہوٹل میں نیپ کے سیکرٹری جنرل محمود الحق عثمانی اور کراچی میں روسی قونصل خانے کے ایک اعلیٰ افسر خاصی دیر تک حالات حاضرہ پر بات چیت کرتے رہے۔ بہت سے لوگوں نے یہ منظر دیکھا اور برداشت کیا۔ روسی سفارتی عملے کی سیاسی شخصیتوں سے یہ کھلے عام ملاقاتیں ——— کبھی زمانہ تھا کہ ایسی ملاقاتوں پر شور مچ جاتا تھا اور اسے اندرونی معاملات میں مداخلت کہا جاتا تھا۔ مگر اب تو ہمارے اندرونی معاملات پر فیصلے ہی بیرونی طاقتیں کرتی ہیں۔

ولی خان، سرمایہ داروں کا نیا گھوڑا

پاکستان کے سرمایہ دار بھٹو کے اس لئے بھی مخالف ہیں کہ اس کے آنے سے جاگیرداروں کا سیاسی تسلط ہو جائے گا۔ اور دوسرا اگر پیپلز پارٹی میں دائیں بازو کے کارکن حاوی ہو جاتے ہیں۔ تب بھی خطرہ ہے۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ولی خان پر تکیہ کیا جائے۔ سرمایہ داروں کے اخبار آج کل ولی خان کا "امیج" بنانے میں مصروف ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن "الفتح" کے لئے لکھیں

پاکستان پیپلز پارٹی اپنے کارکنوں اور عوام کے تعاون سے برسر اقتدار آگئی ہے۔ اقتدار کے حصول کے بعد اس کے کارکنوں کا کیا کردار ہے۔ اُن کے اور اُن کے رہنماؤں کے درمیان کیا رابطہ ہے۔ یہ سب کچھ کارکنوں کی زبانی جاننے کے لئے ہم یہ سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے کارکن منظم اور مضبوط ہو کر وطن دشمنوں پارٹی دشمنوں اور پارٹی کے منشور سے غداری کرنیوالوں کا مقابلہ کر سکیں۔ تمام کارکنوں سے درخواست ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہم سے تعاون کریں نیچے کچھ سوالات دیئے گئے ہیں۔ کارکن ان کے جواب ہمیں تفصیلاً لکھ کر بھیجیں۔ اس کے ساتھ اپنی (۱) تصویر (۲) کارڈ نمبر، (۳) پارٹی یونٹ اور (۴) یونٹ بھی لکھ کر بھیجیں۔ سوالات یہ ہیں۔

(۱) پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد آپ کا پارٹی کے کردار کے بارے میں پہلا تاثر کیا ہے؟

(۲) عوام نے پیپلز پارٹی سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، اُن کے پورے ہونے کے کیا امکانات ہیں

(۳) پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنوں کے درمیان کوئی ربط باقی ہے یا خلاء پیدا ہو گیا ہے۔

(۴) سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنماؤں کا کارکنوں سے کیا رویہ ہے۔

(۵) کارکنوں کے اتحاد اور تنظیم کے لئے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہے۔

(۶) پیپلز پارٹی کے با اثر افراد نے مختلف ذرائع سے کمائی شروع کر دی ہے۔ کیا آپ کے علاقے میں بھی اس قسم کے واقعات ہوئے ہیں۔

(۷) آپ کے خیال میں حکومت کو پارٹی پر کنٹرول کرنا چاہیئے یا پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔

(۸) عام تاثر یہ ہے کہ آپ لوگ پولیس، نوکر شاہی اور عدلیہ کے کاموں میں مداخلت کر رہے ہیں یہ کہاں تک درست ہے۔؟

لوگ خادموں کی جیب گرم کرتے کرتے خود ٹھنڈے ہو جاتے ہیں



'عوام کی خدمت' کے نام پر اُن کی حجامت بنا دی جاتی ہے!

منیر جہلمی

ہمارے یہاں لفظ خدمت کا بہت غلط مفہوم لیا جاتا ہے۔ یہ لفظ بہت حد تک عام فہم بھی ہو چکا ہے جسے ہمارے عوام بہت اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں۔ جہاں دیکھو بڑے بڑے بورڈ لگے ہوئے ہیں جن پر نمایاں حروف میں لکھا جاتا ہے کہ "ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیں، عوام کی خدمت ہمارا اولین مقصد ہے۔"

کاروباری حلقوں میں اس لفظ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "آؤ اور جیب کٹوا کے جاؤ۔"

یہ امر افسوسناک ہے کہ یہ لوگ لوٹ کھسوٹ کے چکروں میں بھول گئے ہیں کہ ہمارے عوام میں اکثریت غریب لوگوں کی ہے اور یہ مفلس عوام اس قابل نہیں ہیں کہ وہ ان خادموں کی جیب گرم کر سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ دولت مند طبقہ تو ان لوگوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن وہ شخص کس سے مدد حاصل کرے گا۔ جس کے بچے فاقہ کشی میں مبتلا ہیں۔ وہ شخص کسی کی جیب نہیں کاٹ سکتا۔ کسی کی تجوری نہیں لوٹ سکتا۔ بھیک نہیں مانگ سکتا۔ اس لیے کہ بھیک مانگنا بھی بہت بڑا جرم ہے۔ ایسے میں ان لوگوں کے لیے کونسی دنیا ہے جہاں جا کر وہ اپنی احتیاجات کو پورا کر سکیں۔ میڈیکل کے ایک طالب علم سے جب معلوم کیا جاتا ہے کہ آپ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کیا کریں گے؟ تو جواب ملتا ہے کہ "میں اپنے پیشے کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت کروں گا" بہت اچھا جواب ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ لوگ کہاں تک ملک و قوم کے خادم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے بڑے دواخانوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ان شفاخانوں میں غریبوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے نمک چھڑکا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مفلسی کا ستایا ہُوا ایک شخص کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور دن بھر کی کمائی کے عوض چند گولیاں اور مکسچر کی شیشی لیے گھر لوٹتا ہے تو معصوم بچوں کے چہرے اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ ان بھوکے ننگے بچوں کو دیکھ کر اس کی حالت اس مجرم کی سی ہو جاتی ہے جس نے کسی کا حق مار لیا ہو۔ ایسے میں وہ شخص ذہنی طور پر مزید پریشان ہو جاتا ہے اور "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی"۔ اگر وہ اس ظلم کے خلاف احتجاج کرتا ہے تو اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا ہے کہ شہر میں بہت سے خیراتی ہسپتال ہیں جہاں مفت علاج کیا جاتا ہے ان خیراتی ہسپتالوں کا جو حال ہے وہ سب جانتے ہیں۔ ایک بیمار شخص جس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے کھڑا ہو سکے ان ہسپتالوں میں اسے دوائی کی خاطر گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا ہے یا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا انوکھا طریقۂ علاج ہے ہمارے ایک دوست کو بھی ایسا ہی ایک تجربہ ہو چکا ہے دو ڈھائی سال قبل ایک حادثہ میں ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ محلّے کے چند حضرات نے انہیں ایک ایسے ہی ہسپتال میں پہنچا دیا۔ انہوں نے کہا کہ جس بے رحمی سے مجھے اسٹریچر پر ڈال کر لے جایا گیا اسے بیان نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے اس طرح لیے جا رہے تھے جیسے میں کوئی بے جان چیز ہوں۔ ایک تو تکلیف کی وجہ سے میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ دوسرے وہ کبھی مجھے اس طرف لڑھکا دیتے کبھی اس طرف۔ آخر کار وارڈ تک پہنچتے پہنچتے میری حالت اتنی خراب ہو گئی کہ مجھ پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ہوش بجا ہوئے تو وارڈ میں موجود تمام مریضوں سے یہ شکایت سنی کہ یہ ڈاکٹر اور نرسیں بڑی ہی بے رحم ہیں۔ اس کا تجربہ بھی مجھے اسی رات ہو گیا۔ تکلیف اس قدر تھی کہ میں تڑپ رہا تھا۔ مجھے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ دو چار نرسیں پاس سے گزریں ان سے التجا کی لیکن وہ آگے نکل گئیں۔ پھر ایک وارڈ بوائے سامنے سے گزرا، اُسے آواز دی کہ بھائی تھوڑا پانی پلا دو وہ اچھا کہہ کر آگے نکل گیا۔ کافی دیر میں اسی تکلیف میں پڑا رہا۔ پھر سامنے سے ایک جمعدار گزرا۔ اسے آواز دی۔ وہ آیا میں نے پہلے اُسے اپنی تکلیف کا احساس دلایا۔ اسے میری حالت پر رحم آ گیا۔ اور جلدی سے جا کر پانی لے آیا۔

دوسرے دن میں نے ایک ڈاکٹر سے شکایت کی جن سے میرے اچھے مراسم تھے۔ ان کی بدولت باقی دن کچھ آرام سے گزرے لیکن وہاں دوسرے مریضوں سے جو سلوک کیا

جاتا تھا وہ مجھ سے مختلف نہ ہوتا۔

ان دواخانوں میں جو ادویات دی جاتی ہیں، وہ معیاری نہیں ہوتیں کیونکہ وہاں کے کمپاؤنڈر یا ڈاکٹر اگر اپنے معیار کو قائم رکھیں گے تو انہیں اپنے اس کاروبار کی زندگی خطرے میں نظر آئے گی جس کا دارومدار سرکاری دواؤں پر ہے ——— اب سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کہاں جائیں ظاہر ہے کہ وہ اپنے آرام کی خاطر ان ڈاکٹروں سے رجوع کریں گے جن کے ذاتی دواخانے ہیں۔ یہاں کے ڈاکٹر مریضوں سے منہ مانگی فیسیں وصول کرتے ہیں اور ایک عام آدمی علاج کے یہ اخراجات برداشت نہیں کر سکتا اور اگر وہ ہمت کر کے انہیں اپنا دکھ بتانے کے لیے چلا بھی جاتا ہے تو ایک یا دو دن دوا لینے کے بعد اس میں اتنی سکت نہیں رہتی کہ وہ ڈاکٹر کا بتایا ہوا کورس مکمل کر سکے۔

ہمارے یہاں کے ڈاکٹر اگر اپنے اندر احساس پیدا کر لیں تو ڈاکٹری وہ مقدس پیشہ ہے جس کے ذریعے انسانیت کی بہت بڑی خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ جو ادویات مریضوں کو دی جاتی ہیں ان پر ڈاکٹروں کی بہت معمولی لاگت آتی ہے اور اکثر دوائیں تو نمونے کے طور پر مختلف کمپنیوں سے حاصل کی جاتی ہیں جن پر انہیں کوئی خرچ نہیں کرنا پڑتا لیکن مریضوں کو ان کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اگر ڈاکٹر منافع کی شرح میں کمی کر دیں تو ہر خاص و عام ان کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔



جس کا ماحصل یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں آباد مہاجرین تمام برائیوں کی جڑ ہیں۔ انہوں نے اپنے اس مکتوب میں اردو بولنے والوں کو چور، بددیانت اور خائن قرار دیا ہے اور مقامی بنگالی حضرات کے متعلق لکھا کہ وہ شرافت کا مجسمہ ہیں۔ ان باہر والوں نے آ کر یہاں مقامی لوگوں کا اخلاق بگاڑ دیا ہے۔ گیلانی صاحب کے اس مکتوب کی چند سطور پیشِ خدمت ہیں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ صالحین کی جماعت اپنی جماعت کو مقبول بنانے کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتی رہی ہے گیلانی صاحب فرماتے ہیں

"ایک چیز جو نمایاں نظر آتی ہے وہ بنگالی باشندوں کی بہاریوں کے مقابلے میں اخلاقی لحاظ سے ایک حد تک برتری ہے یہ لوگ اتنے بگڑے ہوئے نہیں ہیں جتنے باہر سے ہجرت کر کے آئے ہوئے ہیں۔ اگرچہ مستثنیات ہر جگہ موجود ہوتی ہیں۔ دینی اعتبار سے بھی بنگالی بہاریوں کے مقابلے میں زیادہ دیندار اور اسلام پسند ہیں اور پارٹی بازی، گروہ بندی اور فکری انتشار میں نسبتاً کم مبتلا ہیں"

(چراغ راہ جنوری ۱۹۵۵ء)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلم لیگ کے لیے اب یہاں کوئی جگہ نہیں چاہے مرکز ہزار جتن کر جائے۔ اس لیے کہ یہاں مسلم لیگ بہاریوں کی جماعت سمجھی جاتی ہے اور بہاری غیر ملکی بنگال کے سینے پر بوجھ اور قابلِ نفرت سمجھے جاتے ہیں۔"

("چراغ راہ" جنوری ۵۵ء)

گیلانی صاحب کے اس دل آزار مضمون کے اشاعت پذیر ہوتے ہی مشرقی پاکستان کے چالیس لاکھ مہاجرین میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کے ہر علاقے میں اس کے خلاف جلسے کیے جلوس نکالے اور اس نے اتنی شدت اختیار کی کہ مکتوب بنگالہ کے مصنف اسعد گیلانی صاحب کو سید پور کے ایک جلسہ عام میں معافی مانگنا پڑی اور مشرقی پاکستان کے تمام اخبارات میں یہ توبہ نامہ شائع ہوا

یہی وہ صالحین ہیں جو آج مشرقی پاکستان کے مہاجرین (بہاریوں) کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے ہیں۔ مثل تو یہ سنی تھی کہ دبھس میں چنگاری ڈال کر بی جمالو دور کھڑی ہیں۔ لیکن آج تو یہ ہم میں مل کھڑی ہیں۔ خدا ہر مسلمان کو ایسے ابن الوقتوں سے اپنی امان میں رکھے۔

بقیہ: اداریہ

لیکن اتنا بڑا بحران پیدا کرنے والوں کو معاف کر دیا گیا۔ ان کے ناموں کا انکشاف گورنر مصطفےٰ کھر نے ضرور کیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ممکن ہے ان کی معلومات غلط ہوں۔

اس تصویر کے پہلے رخ میں ایک ایسی حکومت نظر آتی ہے۔ جو اتنی سخت گیر ہے کہ وہ لاقانونیت پھیلانے والوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتی۔ اس کے نزدیک قانون کی بالادستی کو اولیت حاصل ہے اور خلاف ورزی کرنے والے چاہے پیپلز پارٹی کے کتنے ہی بااثر افراد کیوں نہ ہوں۔ انہیں جیلوں میں بند کرنے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ مزدور اور کسان جو پیپلز پارٹی کی ریڑھ کی ہڈی ہیں، انہیں بھی قانون شکنی جیسے الزامات کے تحت گرفتار کر لیا جاتا ہے اور کچھ نہیں تو مالکان کی جانب سے ۱۰۷/۱۵۱ تعزیرات پاکستان کے تحت رپورٹ درج ہوتے ہی گرفتاریاں شروع کر دی جاتی ہیں۔

بہت سخت حکومت ہے۔ اپنوں کو ہرگز معاف نہیں کرتی بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پکڑتی ہے۔ انہیں قانون شکن، تخریب کار، بدمعاش اور عوام دشمن ثابت کرنے کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری تمام ذرائع بروئے کار لائے جاتے ہیں اور دم اس وقت لیا جاتا ہے۔ جب انہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

اسی سخت گیر حکومت کا دوسرا رخ دائیں بازو سے اس کا حسنِ سلوک، برادرانہ رویہ اور صلح و آشتی ہے۔ اُدھر عوام کے ناپسندیدہ ترین نام نہاد کا غذی رہنما بیان دیتے ہیں۔ اُدھر حکومت اپنی پالیسی کو فوراً تبدیل کرنے کا اعلان کر دیتی ہے۔ وہ بہاریوں کے مسئلے کو اٹھاتے ہیں تو حکومت ان کے سامنے جھک جاتی ہے۔ ایوان صدر کو اکھاڑہ بناتے ہیں تو سرکار اپنے تمام دروازے کھول دیتی ہے اور ان کے اخبارات صدر مملکت پر کیچڑ اچھالتے ہیں تو پی جاتی ہے۔ ملک کے خلاف سازشوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں تو اسے جمہوریت کے نام پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح پاکستان پیپلز پارٹی کی کشتی کو ایوب اور یحییٰ کے خونی دریاؤں میں سے نکال کر پار لگانے والوں کو معتوب کیا جا رہا ہے اور ایوب، یحییٰ کے اتحادیوں کو کھلی آزادی دے دی گئی ہے۔

اسلام آباد کی یہ پالیسی غلط ہے۔ لغو ہے۔ اس کے اثرات بہت خطرناک ثابت ہوں گے۔ صدر بھٹو کو اس قسم کی پالیسیاں چلانے والوں سے فوراً چھٹکارا حاصل کرنا چاہیئے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں آج عوام اقتدار میں آنے کے بعد ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے جاننے لگے ہیں۔ ان میں سے کوئی آکسفورڈ سے وارد ہو گیا ہے۔ کسی کو ہاورڈ نے تحفے کے طور پر عطا کر دیا ہے۔

"ہمیں آکسفورڈ، ہاورڈ، واشنگٹن کی ضرورت نہیں۔ ہمیں مزدوروں، کسانوں، طالبعلموں اور مظلوم شہریوں کے درمیان میں سے ابھرنے والے رہنماؤں کی قیادت چاہیئے۔"

ادارہ

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
30 MARCH – 6, APRIL, 1972

Haqqi Offset Press Karachi.